اہل سنت کا دینی علمی روحانی ترجمان

ماہنامہ

الغوث

مارچ 2026

مدیر اعلیٰ

مفتی سید شہباز اصدق غوثی



خانقاہ غوثیہ شہودیہ اصدقیہ

سہسرام روہتاس بہار الہند

زیر سرپرستی: وارث مسند غوثیہ سید شاہ عارفین اصدق غوثی شہودی چشتی قادری صاحب

اہل سنت کا دینی علمی روحانی ترجمان

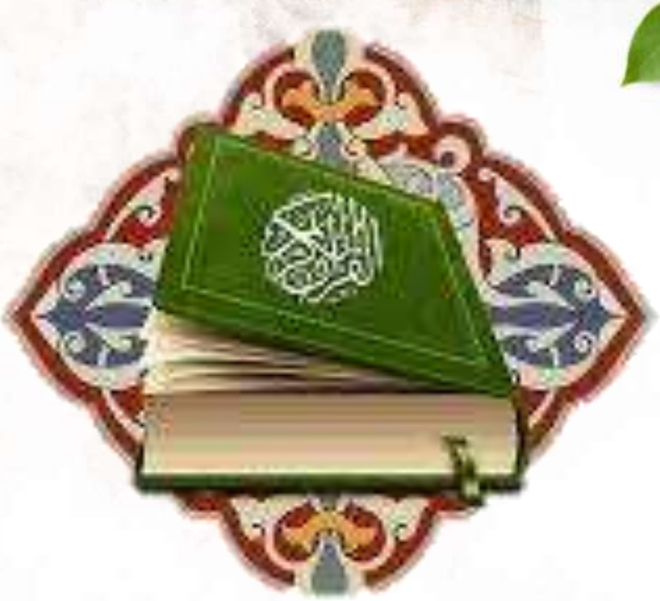
ماہنامہ

الغوث



رمضان المبارک ۱۴۴۷ھ

مارچ 2026



مدیر اعلیٰ

مفتی سید شہباز اصدق غوثی

خانقاہ غوثیہ شہودیہ اصدقیہ سہسرام روہتاس بہار الہند

مشمولات

تزئین و ترتیب

الحمد گرافکس

نوٹ: مضمون نگار اپنے قیمتی مضامین ہمیں درج ذیل واٹس ایپ نمبر یا ای میل پر ارسال کریں۔

ssasdaque@gmail.com +27838463037

ماہنامہ

الغوث

جلد:1، شمارہ:3۔ مارچ 2026
رمضان المبارک ۱۴۴۷ھ

مدیر اعلیٰ:

مفتی سید شہباز اصدق

+27838463037

معاونین

مولانا تبارک حسین امجدی

مفتی سبحان رضا امجدی

رفقائے ادارہ

حضرت علامہ
سید محمد علیم الدین اصدق مصباحی صاحب
(ساؤتھ افریقہ)

حضرت علامہ افتخار احمد قادر مدنی صاحب
(مدینہ منورہ)

حضرت پروفیسر سید شمہا نجیب گیلانی صاحب
(انڈیا)

ناشر

خانقاہ غوثیہ اصدقیہ، سہسرام، روہتاس بہار

09097467826

ای میل

ssasdaque@gmail.com

نوٹ

اس شمارے کے قلم کاروں کی آراسے ادارہ اور ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

احباب خانقاہ کے نمبر پر رابطہ کرکے ہر ماہ رسالہ مفت حاصل کریں۔

گزارش

علم دوست حضرات Rs786 کے ذریعہ اعزازی ممبری فیس قبول کرکے اس علمی کام میں ادارہ کی مدد کرسکتے ہیں

آپ کے تاثرات

از قلم

ڈاکٹر سید شہما نجیب گیلانی صاحب
دہلی ماڈرن پبلک اسکول، کشمیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عزیزم سید شہباز اصدق سلمہ "الغوث" کا ڈیجیٹل رسالہ پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ اتنے کم وقت میں رسالہ کو منظر عام پر لانے کی تمہاری کاوشوں کو میرا اسلام ہے۔ ایسے وقت میں جب دنیا سے پڑھنے لکھنے کا شوق خاص کر نوجوان نسلوں میں تقریباً فوت ہو چکا ہے، ایک جواں سال مرد نے لوگوں میں اس ذوق و شوق کو زندہ کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے یہ اپنے آپ میں داد و تحسین کا مستحق ہے۔ اللہ تمہاری اس کاوش کو قبول فرمائے۔

الحمد للہ! "ماہنامہ الغوث" کو تم نے مضامین کے انتخاب سے بیلینس کرنے کی کوشش کی ہے جو وقت کا تقاضہ ہے۔ ہر جگہ یہ ماہنامہ عام مسلمانوں کے دینی و دنیاوی مسائل کی ترجمانی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یوں تو سارے ہی مضمون علم و ادب کی ترجمانی کر رہے ہیں پر خصوصی طور پر مفتی ازہار احمد صاحب کا مضمون "ترجیحات میں ترمیم وقت کا جبری تقاضا"، بچوں کا کالم، خواتین کے مسائل اس ایڈیشن کی جان ہیں۔ امید کرتا ہوں کے آئندہ بھی اسی طرح کے مضمون اس رسالہ کو رونق بخشتے رہیں گیں۔ کوشش کریں کہ اس رسالہ میں اسلامی فلسفہ، سائنس اور تاریخ کو بھی مستقل جگہ ملے۔

کتابوں کی ورق گردانی کرنے میں جو لطف ہے، وہ بھلا اسکرین پر پڑھنے میں کہاں! خاص کر بزرگوں کو اس میں پریشانی ہوتی ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اس کی ہارڈ کاپی بھی جلد از جلد قارئین تک پہنچ جائے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ایک مشکل مرحلہ ہے مگر تم جیسے مرد مجاہد کے لیے نہیں۔ اللہ تمارے علم، عزم اور ذوق میں دن دونی رات چوگنی ترقی دے اور تمام کاوشوں کے لیے اجر عظیم سے نوازے۔ آمین

آپ کے تأثرات

از قلم
حضرت علامہ
محمد ظفر الدین برکاتی مصباحی
سابق مدیر اعلیٰ ماہ نامہ کنز الایمان دہلی

برکاتی نامہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔۔۔۔ محترم حضرت مفتی سید شہباز اصدق غوثی صاحب!

آپ کی تازہ ترین خیریت اور شہبازی صورت حال سے ابھی ابھی باخبر ہوا ہوں. ماشاء اللہ مبارک ہو۔

ماہنامہ الغوث کی پہلی جلد کا پہلا شمارہ جنوری 2026 رجب 1447ھ آن لائن دیکھ رہا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو یہ نہیں لکھ سکتا کہ آپ ہماری برادری یعنی اہل قلم کے عملی نمائندوں میں شامل ہو گئے کیوں کہ آپ تو فی الحال ایک مجلہ کے مدیر اعلیٰ ہیں لیکن میں ابھی سابق مدیر اعلیٰ ہو چکا ہوں البتہ لکھنا پڑھنا سست رفتاری سے جاری ہے اور پہچان ایسی بن چکی ہے کہ جاری رہے گا۔ ان شاء اللہ۔

خیر! آپ کے لیے ایک مشورہ ہے کہ چند منتخب اہل قلم کو مستقل لکھنے کی دعوت دیں جو ہر شمارے میں جلوہ افروز ہوں تاہم اپنے رسالہ کی پالیسی کے خلاف ان کی بھی کوئی تحریر شامل نہ کریں۔ سال میں کوئی ایک خصوصی شمارہ ضرور شایع کریں تاکہ آپ کے رسالے سے لوگوں کا جذباتی رشتہ قائم ہو۔ قیامت آجائے وہ بہتر ہے لیکن کبھی بھی مشاجرات صحابہ بلکہ تابعین کے آپسی تنازعات پر کوئی مضمون شامل نہ کریں۔ اس لیے کہ قیامت تو یقینی ہے لیکن ایسے مضامین کی وجہ سے آپ کے مقصد و مشن کی بے یقینی طے ہو جائے گی اور یاد رہے کہ جو لوگ ایسے مسائل میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ رسالے نہیں خریدتے۔

سب سے اہم اور کام کی بات یہ ہے کہ آپ جس سلسلہ طریقت اور خاندان و علاقے سے ہیں۔ اس سلسلے اور علاقہ و خاندان کی شخصیات اور دینی تعمیری خدمات و کارنامے کا تذکرہ ہر ماہ ضرور ہونا چاہیے لیکن اس پہلو کو

حاوی نہ ہونے دیں۔ اس ماہنامہ کے تعارفی گوشے میں آپ اپنے متعلقہ تعلیمی ادارہ کے بانیان و معمار صاحبان اور اساتذہ و کار آمد فارغین کا تذکرہ بھی ماہ بماہ شامل کر سکتے ہیں تاکہ ایک خاص حلقہ آپ کے مجلہ سے جذباتی طور پر جڑا رہے اور آپ کے مجلے کو اپنا مجلہ سمجھتا رہے۔

مذہبی اسٹیج کے پڑھے لکھے کہنہ مشق یا نو آموز نعت گو شاعروں کو بھی جگہ دیتے رہیں لیکن شاعرانہ مزاج و معیار باقی رکھنے کے لئے معیاری کلام کا ہونا ضروری ہے اور کسی بھی عرس و جلسہ اور جلوس و اجلاس کی وہی رپورٹ شایع کریں جس میں کسی تعمیری سوچ اور کردار جھلک رہا ہو یعنی ہر جلسہ جلوس اور کانفرس و عرس کی رپورٹ لگانے سے پرہیز کریں اور ہاں! جب تک کوئی کتاب آپ کو دستیاب نہ ہو جائے تب تک اس پر تبصرہ نہ شایع کریں اور میرا تجربہ یہ ہے کہ واقعی اچھا تبصرہ آج کا مصنف و مولف جھیل نہیں پاتا ہے، اس لیے متعدد کتابوں کا ایک ساتھ تعارف کرا دیں، یہی کافی ہے۔

اب آخری بات یہ عرض ہے کہ آپ کا مجلہ ہے جو بنیادی طور پر آپ کے ذاتی اور شخصی جذبات کا نتیجہ ہے، اس لیے اس کی بقا و تحفظ اور توسیع و ترقی میں بنیادی کردار بھی آپ ہی کا ہو گا جس کی ادنی سی مثال، صبر و استقامت ہے. اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ بھی یاد رکھیں کہ اپنے اداریے اور ادارتی نوٹس وغیرہ کے ذریعے جماعت کے سماجی فلاحی اداروں، مذہبی شخصیات، دینی تعلیمی اداروں اور خانقاہی درگاہی حضرات کے آپسی اختلافات و تنازعات میں کبھی فریق بننے کی غلطی نہ کریں اور ضرورت محسوس کریں تو وضاحتی نوعیت کی تحریر کسی دوسرے قلم کار سے لکھوا کر شامل کریں۔ باقی آپ دنیا دیکھے ہوئے ہیں اور ہم سے زیادہ بہتر جانتے ہیں دنیا جہان اور جماعتی مسائل و ماحول کو، مزید کچھ کہنا قبل از وقت ہو گا۔

آپ نے پیشانی پر لکھا ہے "اہل سنت کا دینی، علمی اور روحانی ترجمان" یہاں دینی کے بعد کوما، اور علمی کے بعد "اور" کی ضرورت نہیں، رواں دواں لکھیں دینی علمی روحانی ترجمان۔

اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام اور محبوب بندوں، بطور خاص عطاء رسول سلطان الہند کے صدقے ماہنامہ الغوث کو صحت مند زندگی عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین یارب العالمین بحق سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام



ایپسٹن فائلز ایک نظریاتی تجزیہ

مدیر اعزازی: مولانا پٹیل عبد الرحمٰن مصباحی، گجرات

ہمارا زمانہ چوں کہ آثار قیامت کے ظہور میں تیزی کا زمانہ ہے لہٰذا ہر چند دنوں میں کوئی ایسا ناقابل یقین حادثہ رونما ہونا، جو مجموعی طور پر تمام بنو نوع آدم کو حیرت میں ڈال دے، کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔ ایسے واقعات اپنے گھناؤنے پن کی وجہ سے حیرت انگیز ضرور ہوتے ہیں مگر اس پر ظاہر کیا جانے والا سطحی رد عمل اس سے بھی زیادہ تعجب خیز ہوتا ہے۔ ایپسٹن فائلز کا قضیہ اسی طرح کی تازہ مگر بوسیدہ واردات میں سے ایک ہے۔ لوگ دنگ ہیں اور اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں بوکھلائے ہوئے ہیں کہ انسان ایسا اور اتنا گھناؤنا کیسے ہو سکتا ہے؟ اتنے بڑے کہے جانے والے لوگ اور ایسے کالے کرتوت؟ مگر اہل نظر جو "جدید دنیا" کے بنیادی نظریات اور عملی ڈھانچے کو خوب کرید کر دیکھ چکے ہیں اور مغربیت کو بہت گہرائی سے جانتے ہیں وہ بس لمبی سانس لے کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو ہونا ہی تھا! بلکہ زیر لب یہ بھی بول دیتے ہیں کہ آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا۔

ایپسٹن فائل کا عنوان چوں کہ بہت زیادہ پھیلا ہوا ہے، اتنا کہ درجن بھر جہات سے اس سلسلے میں بات ہو سکتی ہے، لہٰذا ہمیں اپنے اسلوب سے ہٹ کر اسے چند الگ الگ ذیلی عناوین کے تحت زیر بحث لانا ہوگا تاکہ فہم میں قدرے سہولت پیدا ہو جائے۔ ہم مان کر چل رہے ہیں کہ فائلز یا اس میں درج ناموں اور کرتوتوں کی قدرے تفصیل سے قارئین واقف ہیں، ویسے بھی ہمیں اس کی تفصیلات سے زیادہ غرض نہیں اس لیے کہ حادثہ کی بنیاد میں پیوست نظریاتی مواد کو زیر بحث لانا ہماری نظر میں زیادہ اہم ہے۔ ہم نے چار سوالات کی شکل میں موضوع کو ترتیب دینے کی کوشش کی ہے جو آگے چل کر جوابات میں زیادہ واضح اور قابل فہم ہوتا جائے گا۔ مفصلہ ذیل کے مطابق عنوان کی تقسیم چار حصوں میں ہوگی۔

ایک: ایسی فائلز کو منظر عام پر لایا جانا اپنے آپ میں ایک سوال طلب امر ہے۔ اس کے نشر کا جواز؛ نظریۂ شفافیت کے تحت بیان کیا جاتا ہے، مگر نظریۂ شفافیت خود کسی ٹیڑھی کھیر سے کم نہیں، لہٰذا نظریہ شفافیت کو باریکی سے سمجھنا پہلا مرحلہ ہے۔ ویسے تو اِن فائلز کو نشر کرنے کے خاص وقت پر بھی سوالات ہو سکتے ہیں مگر ہم اسے قاری کی قیاس آرائی پر چھوڑتے ہیں۔

دو: لبرل اندازِ فکر کو جاننا یعنی ایک لبرل ذہن کا بندہ اپنے تئیں ایسے واقعات کو کس طور پر دیکھتا ہے؟ کیا اس کے لیے ایسے واقعات اتنے ہی تشویش ناک ہیں جتنے کہ ایک عام انسان کے لیے یا ایک مذہبی ذہن کے لیے ہوتے ہیں؟ اس ضمن میں ٹھیٹھ لبرل ذہن کے لوگ بھی شامل ہیں اور وہ لوگ بھی جو کسی حد تک عملاً مذہبی رسومات ادا کرتے رہتے ہیں مگر ذہن؛ شعوری یا غیر شعوری طور پر لبرل والا رکھتے ہیں۔

تین: کیا یہ محض مغرب کے بڑے بڑوں کا اخلاقی زوال ہے یا پھر بات اس سے آگے کی ہے جسے بہت گہرائی کے ساتھ دھیان سے سمجھنے کی ضرورت ہے؟ یعنی ایک گرے ہوئے کردار کا آدمی کہیں کا بھی ہو سکتا ہے مشرق یا مغرب اور کیسا بھی ہو سکتا ہے امیر یا غریب، کیا بات اتنی سادہ سی ہے؟

چار: سیکولر جمہوریت یا جدید ریاست کے ڈھانچے میں ایسے مجرمانہ کردار کے لوگوں کے لیے کس حد تک پذیرائی ہے؟ کیا جدید ریاست میں یہ سب کچھ ناقابل قبول حرکت ہے یا پھر ایک اتفاقاً پیش آنی والی صورتحال جس کا تب تک دفاع کیا جائے گا جب تک براہ راست کوئی قانون اس پر لاگو نہیں ہوتا یا لوگ انقلابی نعروں کے ساتھ تختہ پلٹ کے لیے نکل نہیں پڑتے؟

اِن سوالات کے جوابات جوں جوں کھلتے جائیں گے ویسے ویسے ایپسٹن فائلز کے حقائق بھی کھلتے جائیں گے۔ چوں کہ موضوع کافی گھناؤنے واقعہ سے متعلق ہے اور تھوڑا سا ٹیڑھا ہے سو ہم چاہیں گے کہ تحقیق کی گنگا الٹی ہی بہے۔ جواب دینے میں ہم چوتھے سوال سے شروع کر کے پہلے تک جائیں گے اور پھر ایک خاتمہ ایڈ کر کے ختم کر دیں گے۔ چار مرحلوں میں بہت سے جملے ہوں گے جہاں رک کر مزید غور کرنے کے اپنے فائدے ہوں گے، اُس علم دوست شخص کے لیے جو حقائق تک پہنچنے کا وافر جذبہ رکھتا ہو۔ یہ بھی کوشش رہے گی کہ بات زیادہ پیچیدہ نہ ہونے پائے مگر مفہوم کی وسعت اگر کہیں تعبیر میں لپٹ کر اسے گنجلک کر دے تو بصیرت والا قاری خود اپنے حسنِ نظر سے اس کی پرتیں کھول لے گا ایسا ہماری چھٹی حس کہتی ہے۔

بہر حال چلیں! الٹی گنتی شروع کرتے ہیں، بہت سنجیدگی سے ملاحظہ کریں۔ ہم سوال نہیں دہرا رہے، سیدھے جواب لا رہے ہیں، قارئین ہر جواب سے پہلے ربط کے لیے دوبارہ سوال پر نظر ڈال سکتے ہیں۔

چار= سیکولر جمہوریت یا جدید ریاست میں حکومت اخلاقیات یا ذمہ داری کے احساس سے نہیں چلتی، بلکہ بس چلتی ہے اور جب تک وہ چلتی رہتی ہے تب تک کسی کو نہیں پرواہ کہ چلانے والے نے کیا کیا، کیوں کیا، کس حد تک گھٹیا کیا۔ اگر صبح مارکیٹ کھلے ہیں، کچہریاں انصاف ناپ تول کر دے رہی ہیں، سڑکیں اپنی ناکہ بندیوں کے ساتھ کھلی ہیں، اسکولوں میں تعلیم کا کاروبار جنسی آزادی کے ساتھ جاری ہے اور اسپتال موت وحیات کی کشمکش میں بہتر موت پر بدتر حیات کو ترجیح دے رہے ہیں، تب تک سب کچھ نارمل ہے۔ مغربی جمہوریت میں تو دہائیوں سے یہ بالکل معمول کی بات رہی ہے مگر اب مشرق میں بھی تقریباً وہی ماحول پیدا ہو چکا ہے، یا یوں کہیں کہ مشرق اِس معاملے میں بھی مغرب سے پچاس سال پیچھے ہی رہا۔

بہرحال جدید ریاست میں تعلیمی اداروں اور سیاسی حد بندیوں کے ذریعے شہریوں کی ایسی تربیت کر دی گئی ہے کہ جب تک سب معمول کے مطابق یا کچھ اونچ نیچ کے ساتھ چل رہا ہے تب تک کسی کو کوئی فکر نہیں ہے۔ آج کی دنیا میں جمہوری بادشاہ کی بد چلنی کو حکومت کے چلن سے جدا کر لیا گیا ہے بالکل ایسے ہی جیسے ماضی قریب میں بد چلن حکومتوں کو سدھارنے کے نام پر مذہب کو حکومت سے جدا کر دیا گیا تھا۔

گویا چوتھے سوال کے جواب میں ہم بہت اختصار کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہاں! سیکولر جمہوریت کا ڈھانچہ کھڑا ہی اس طرح کیا جاتا ہے کہ بد کردار لوگوں کی پذیرائی و پشت پناہی ہو سکے۔ پھر چوں کہ ووٹنگ کے نام پر ایوان ایسے سینکڑوں نمائندوں سے بھرا ہوا ہے جو بد کرداری میں ایک دوسرے پر واضح سبقت لے جانے والے ہیں، لہٰذا اگر کسی دن عوام کا غصہ کسی ایک بد کردار پر پھوٹ پڑے اور نوبت انقلاب اور تختہ پلٹ تک آ بھی جائے تو زیادہ حرج نہیں، اس لیے کہ ریاست عوام کی وقتی خوشی کے لیے ایک کو برطرف کرے گی اور مسکرا کر کہہ دے گی، یہ نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی۔ یوں آج کی دنیا میں ہر مرتبہ جدید سیکولر ریاست ہی ایمان داری اور بد عنوانی کے دو متضاد میدان ایک ساتھ مارنے میں کامیاب رہتی ہے۔

تین= کچھ لوگ بس یہ گمان کر کے مطمئن ہیں کہ یہ اخلاقی زوال ہے، کوئی عام شخص یا کوئی خاص سیاست دان یا کوئی سائنس دان، کیا فرق پڑتا ہے جب وہ اخلاقی طور پر گر جائے تو کسے باشد، وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ گویا یہ فائلز ایسے ہی چند سرپھروں کی داستان ہے اور بس۔ ہم کہتے ہیں اخلاقی تنزل یا اخلاقی جرائم کا پایا جانا کسی بھی انسانی معاشرے کا ایک حصہ ہے، مگر یہاں بات صرف اخلاقی گھناؤنے پن کی نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ فرد کے انفرادی نظریہ کا ہے جو کہ در حقیقت اُس معاشرتی کُل کا متفقہ عقیدہ ہے جس کا وہ محض ایک فرد ہے۔

ہمارے یہاں اب تک مغرب کو محض اشیاء کی ترقی کے ضمن میں دیکھا گیا ہے، عموماً لوگ تہذیبِ مغرب کی نظریاتی بنیادوں سے صَرفِ نظر کر کے صِرف مغرب کی ترقی کو سامنے رکھتے ہوئے عروج و زوال کی داستانیں ترتیب دے ڈالتے ہیں، مگر نہیں سمجھتے کہ جب "ترقی" ہی کسی معاشرتی کُل کی کُل ذمہ داری ٹھہرا دی گئی ہو تو ترقی کے نام پر برہنہ گھومنے سے لے کر بے تحاشا جنسی تسکین کا سامان کرنے تک سب کچھ صرف اس لیے جائز ٹھہرتا ہے کہ ہم ترقی یافتہ ہیں۔

ایک معاشرہ اگر "آزادی" اور "ترقی" کے ایسے نعروں پر اپنی بنیاد رکھتا ہے جہاں انفرادی لذت اور مفاد کے لیے سارے اخلاقی دائرے توڑے جا سکتے ہیں اور تمام معاشرتی یا خاندانی اقدار کو رد کیا جا سکتا ہے یہ کہہ کر کہ ایک آزاد معاشرے میں ہر فرد اپنی مرضی کا مالک ہے جب تک کہ وہ کسی دوسرے کی آزادی میں خلل نہ ڈالے، تو ایسے معاشرے میں چند افراد کی جانب سے؛ اپنی آزادی کے ساتھ لذت کی انتہا تک پہنچنے کے لیے؛ انتہائی گھناؤنا راستہ اپنانے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا۔

اگر مغربی معاشرے کی سائنسی بنیادوں کو کھود کر تجزیہ کیا جائے تو "نظریۂ ترقی" کا سڑا گلا فکری مواد ہاتھ لگے گا۔ مغربی تہذیب کے پس منظر میں ترقی یافتہ ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اپنی ٹیکنالوجی کی طاقت سے ایسے گھناؤنے افعال کر سکتے ہیں، پھر ان کی وجہ سے ممکنہ طور پر ہونے والی جسمانی تباہی سے بچ بھی سکتے ہیں، سیاسی پاور کے ذریعے اِن کاموں کی معاشرتی سزا بھی رکوا سکتے ہیں اور میڈیا چوں کہ ہمارے کنٹرول میں ہے لہٰذا میڈیا کی ستر پوشی مزید ہمیں اپنے ہمہ جہت ننگے پن کے باوجود مظلومیت کے لبادے میں ڈھانپ کر رکھ سکتی ہے، سو ہم اپنی ترقی کی اعلیٰ منزل پر خواہش کی بے تحاشا تکمیل بلا تأمل کر سکتے ہیں۔

گویا فائلز میں موجود اخلاقی تنزل کے یہ نمونے در اصل وہ نتائج ہیں جو کسی معاشرے میں "نظریہ ترقی" کے اپنے عروج پر پہنچنے پر بر آمد ہونے کا قوی امکان بلکہ غالب گمان موجود ہوتا ہے۔ یہ محض اخلاقی زوال نہیں ہے بلکہ نظریہ ترقی کا کھوکھلا پن ہے جو کسی بھی معاشرے کو سڑا گلا کرنا قابل زیست بنا دیتا ہے۔

دو= اب یہ سوال آتا ہے کہ کیا لبرل ذہن جو چیزیں سامنے آئی ہیں ان کو اتنا ہی برا سمجھتا ہے؟ اس کے جواب میں سادہ سی بات یہ ہے کہ لبرل ذہن کا سوچا سمجھا رسپانس ایسے معاملات میں یہ ہوتا ہے کہ "ایک حد تک تو ٹھیک تھا، اتنا زیادہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔" لبرل ذہن کو پہلے ہی آزادیٔ افکار و اظہار کا چسکا لگا ہوتا ہے، وہ حقوق کے روانا روانعروں میں ایک خاص نہج پر پروان چڑھا ہوتا ہے۔ لبرل سوچ کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ ہم اگرچہ نیک ہیں مگر برائی اختیار کرنا کسی اور کی پسند ہو سکتی ہے، لہٰذا ہمیں ان کے گناہوں پر برداشت کا رویہ اپنانا چاہیے، جیسے ہمیں نیکی کرنے کی آزادی ہے ویسے ہی انہیں گناہ کرنے کی آزادی ہے، اور ہمارے گرد دنیا میں ہر کوئی اپنی آزادی برت رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لبرل اقدار پر چلنے والے معاشروں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا ہے۔

لبرل شخص اپنے گرد کی دنیا کو کچھ اس طرح دیکھتا ہے کہ اختلاط مرد و زن کو روکنا تنگ نظری ہے، یوں ہی اگر زنا بالرضا ہو رہا ہے تو یہ مرد و عورت کی اپنی آزادی ہے، ہمیں اس میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ بلکہ ہم جنس پرستی کا جذبہ بھی اگر کہیں زور مار رہا ہے تو یہ ان کا حق ہے کہ اپنی انفرادی آزادی کے طور پر وہ ایسا کریں۔ یہاں تک تو سارے لبرل متفق ہوتے ہیں، پھر کچھ ذہنی مریض جانوروں اور بچوں سے تسکین کا خبیث نعرہ لگاتے ہیں، یہاں پہنچ کر باقی لبرل معاشرہ تھوڑے سے تذبذب کے ساتھ دانستہ نظریں چرا لیتا ہے اور جیسے اُن درندوں پر تنقید کرنے والوں کو ٹال نہیں پاتا ویسے ہی ان کی تحسین کرنے والے لبرل افراد کو روکتا بھی نہیں ہے۔

حاصل یہ کہ لبرل معاشرہ ایسے کرتوت دیکھتا تو ہے مگر اپنے اصولوں کے مطابق اس پر آواز بلند نہیں کر سکتا۔ گویا ہم جن افعال کو گھناؤنا سمجھ رہے ہیں؛ اس لیے کہ ہم اب تک ایسے معاشرے میں ہیں جہاں اسلامی اقدار بہت حد تک رائج ہیں؛ وہ

افعال لبرل معاشرے یا لبرل ذہن کے لیے کسی حد تک ناپسندیدہ تو ہیں مگر گھناؤنے نہیں، شاید ان کے لیے یہ اتنا ہی برا ہو جتنا کسی مرد کا سر راہ لوگوں کی طرف رخ کر کے پیشاب کرنا۔

ایک = نظریہ شفافیت کے باطن کُش ہونے کو ہم کسی اور تحریر میں کھولیں گے، فی الحال کے لیے اس کی اتنی معرفت کافی ہے جس سے متعلقہ موضوع کی قباحت واضح ہو جائے۔

نظریہ شفافیت Transparency کا موٹا موٹی مفہوم یہ ہے کہ معلومات سیدھی اور آسان زبان میں ہونی چاہئیں، عوام کے لیے ہمہ وقت دستیاب ہونی چاہئیں، پھر وہ جیسی ہیں ویسی ہی آگے بڑھا دی جائیں بغیر کسی وضاحت یا نتیجے کے، نیز جو ادارے معلومات کو لیے ہوئے ہوتے ہیں وہ صرف انفارمیشن کو ظاہر کر دینے کے ذمہ دار ہیں، اس کے آگے کسی ایکشن کے ذمہ دار نہیں۔

یہ بظاہر بڑا خوبصورت نظریہ معلوم ہوتا ہے کہ بھئی! جب ہم انسان ایک ساتھ ایک معاشرے میں رہتے ہیں تو ہم میں سے ہر ایک کو نہایت شفاف انداز میں مربوط ہونا چاہیے۔ کسی کے پاس چھپانے کے لیے کچھ نہ ہو یا دوسرے لفظوں میں کسی کے پاس کچھ ایسا چھپا ہوا نہ ہو جس سے دوسروں کو دھچکا لگ سکتا ہو۔ مگر اِس شفافیت کے نام پر سوائے اعلانِ جرائم کے اور کچھ سامنے نہیں آتا۔ بات یہ نہیں کہ اُن درندوں کی تنہائیاں کتنی گھناؤنی ہیں، بات یہ ہے کہ ان تنہائیوں کو ظاہر کر کے آپ کی میری ہم سب کی تنہائی میں خلل ڈالا جا رہا ہے۔ مسئلہ یہ نہیں کہ وہ بد باطن لوگ ہیں مسئلہ یہ ہے کہ ان کے باطن کی خباثت کو ہمارے درمیان علی الاعلان ظاہر کر کے ایسے متعارف کرایا جا رہا ہے جو ہمارے باطن کو بری طرح ڈیمج کرنے کے لیے کافی ہے۔

مزید یہ کہ ایسی شفافیت کے ذریعے نیکی اور بدی کو ہمسر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ گویا یہ جتلایا جاتا ہے کہ نیکی کی ترغیب اور برائی پر ترہیب کوئی چیز نہیں۔ بدترین جرائم کو بھی اُسی لب ولہجے اور سادگی کے ساتھ عوام میں رکھا جائے جس میں اچھے کاموں یا چھوٹی موٹی کوتاہیوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مجموعی طور پر ہم پورے معاشرے کو خیر کی ترغیب دلائیں گے یا شر سے نفرت کی طرف لے جائیں گے، بس ہم کسی صحافی کے خبر سنانے کی طرح برائیوں بلکہ شدید ترین جرائم کو سنا کر فارغ ہو جائیں گے۔ یہ ہے نظریہ شفافیت کا وہ پوشیدہ شر جو جرائم کو ایکسپوز کرنے کے نام پر ان کو نارملائز کو تا ہے۔ جدید مغرب ایسی بہت سی اصطلاحات سے بھرا پڑا ہے جن کا ظاہر خوش نما اور باطن نہ صرف یہ کہ شر آمیز ہوتا ہے بلکہ اکثر عذاب آلود بھی ہوتا ہے۔

اختتامیہ = طویل کافی طویل ہو جانے کے باوجود وعدے کے مطابق اختتام بھی جوڑ لیتے ہیں جو کہ قیمتی نکات سے خالی نہ ہو گا۔ اگرچہ محررہ بالا مواد اپیسٹن فائلز کے ڈسٹ بین سے متعلق تھا مگر کوڑے دان سے اتنا سبق تو لیا جا سکتا ہے کہ فلاں فلاں چیز گندگی ہے جسے کسی صالح ماحول یا جگہ پر نہیں آنے دینا چاہیے، آ جائے تو پھیلنے نہیں دینا چاہیے۔ یہاں ہم بغیر کسی پیچیدگی کے چار

خباثتوں کا ذکر کر دیتے ہیں۔ جدید سیکولر ریاست، لبرل انداز فکر، نظریہ شفافیت اور نظریہ ترقی۔ اس تناظر میں ہم اہل اسلام پر اپنے اسلامی معاشرے کے لیے چند اقدامات کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

ا... اپنے سیاسی شعور کو سیکولر جمہوریت کی طرف مائل ہونے سے بچانا، یعنی بوجہِ اضطرار اس کی کم ترین شکل کو اپنانے پر اکتفا کرنا، اسے کوئی مستقل نافع نظام نہ سمجھنا۔ کم نصیبی سے پچھلی نصف صدی میں ایسا ہو چکا ہے اور اب تدارک کی سخت ضرورت ہے۔

۲... اپنی معاشرتی فضا کو لبرل ڈھانچے پر ڈھلنے سے بچانا، یعنی یہ سمجھنا کہ جدید تعلیم کے نام پر ساری ذہنی لبرل خرافات پال لینے کے بعد ظاہری اعمال کے اسلامی ڈھنگ پر ہونے کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں رہ جاتی ہے، لہٰذا بطور مسلمان لبرل نظریات کی بد عقیدگی سے بچنا ہماری اولین ذمہ داری ہے۔

۳... بے تحاشا ترقی کے نعرے میں بہنے کی بجائے دنیا و آخرت کی فلاح کا متوازن طرز زندگی لے کر چلنا، بلکہ دنیا کی فلاح اس میں سمجھنا کہ جس دنیا کے ذریعے آخرت کمالی جائے وہ دنیا اچھی ہے، باقی محض متاع اور مچھر کے پر سے بھی گئی گزری۔

۴... خارجی مادہ پرستی سے اپنے داخل کو محفوظ رکھ کر اپنی روحانیت کو زندہ رکھنا، یعنی شفافیت کے اس بہاؤ سے اپنے آپ کو باہر رکھنا جو اٹھتا تو ظاہر سے ہے مگر باطن کو بھی ساتھ بہالے جاتا ہے۔ شفافیت کے نام پر اپنے معاشرے میں افشائے شر کا ماحول نہ بننے پائے یہ نگرانی رکھنا ضروری ہے۔

یہ کرنا لازم ہے، ورنہ کیا فرق پڑتا ہے کسی شخص کا نام یہودی طرز کا ہو یا اسلامی طرز کا، وہ مشرقی ہو یا مغربی، بہر حال اگر اس کے سوچنے سمجھنے کے سارے تناظر خالص لبرل سیکولر ترقی پسند ہوں تو معاشرے اور فرد کا نام تو جدا جدا ہو سکتا ہے مگر نتیجہ اُس سے کم گھناؤنا نہیں آ سکتا جتنا گھناؤنا ابھی فائلز کے انکشاف میں نظر آ رہا ہے۔ وقت رہتے اپنے معاشرے کی فکری بیماریوں کو پہچان کر اس کا علاج کیجیے اور اپنے گرد کے ماحول کو جہنم بننے سے، نیز اپنے قرابت داروں کو جہنم کا ایندھن بننے سے بچا لیجیے۔

درس قرآن



سورۂ قدر کی آیات کا خلاصہ

از: مفتی فیضان رضا امجدی، خلیل آباد، یوپی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آج میرا روئے سخن قرآن مقدس کی معروف سورہ "سورۃ القدر" کی تفسیر کی طرف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ (1) وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ (2) لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ شَهْرٍ (3) تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ (4) سَلَامٌ هِيَ حَتَّى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (5)

ترجمہ: بے شک ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں اتارا ہے۔ اور آپ کو کیا معلوم کہ شب قدر کیا ہے۔ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس میں فرشتے اور جبریل اترتے ہیں اپنے رب کے حکم سے ہر کام کے لیے۔ وہ صبح روشن ہونے تک سلامتی کی رات ہے۔

تفسیر: اس ایک رات میں نیک عمل کرنا ہزار راتوں کے عمل سے بہتر ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی امتوں کے ایک شخص کا ذکر فرمایا، جو تمام رات عبادت کرتا تھا اور تمام دن جہاد میں مصروف رہتا تھا، اس طرح اس نے ہزار مہینے گزارے تھے، مسلمانوں کو اس سے تعجب ہوا تو اللہ تعالی نے آپ کو شب قدر عطا فرمائی اور یہ آیت نازل کی کہ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

اور ''تفسیر عزیزی'' میں ہے: حضراتِ صحابہ کرام عَلَیْہِمُ الرِّضْوَان نے جب حضرتِ شمعون رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ کی عبادات و جہاد کا تذکرہ سنا تو انہیں حضرتِ شمعون رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ پر بڑا رشک آیا اور مصطفٰے جانِ رحمت صَلَّی اللّٰہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی خدمتِ بابرکت میں عرض کیا: ''یارَسُولَ اللّٰہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم! ہمیں تو بہت تھوڑی عمریں ملی ہیں، اِس میں بھی کچھ حصہ نیند میں گزرتا ہے تو کچھ طلب معاش میں، کھانے پکانے میں اور دیگر اُمورِ دُنیوی میں بھی کچھ وقت صرف ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہم تو حضرتِ شمعون رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ کی طرح عبادت کر ہی نہیں سکتے، یوں بنی اِسرائیل ہم سے عبادت میں بڑھ جائیں گے۔''

اُمت کے غمخوار آقا صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم یہ سن کر غمگین ہوگئے۔ اُسی وَقت حضرتِ سَیِّدُنا جبرئیل اَمین عَلَیۡہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلام سورۂ قدر کا تحفہ لے کر حاضر خدمت بابرکت ہوگئے اور تسلی دے دی گئی کہ پیارے حبیب (صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم) رَنجیدہ نہ ہوں، آپ صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی اُمت کو ہم نے ہر سال میں ایک ایسی رات عنایت فرمادی کہ اگر وہ اُس رات میں عبادت کریں گے تو (حضرتِ) شمعون (رَحۡمَۃُ اللہِ تَعَالٰی عَلَیۡہِ) کی ہزار ماہ کی عبادت سے بھی بڑھ جائیں گے۔

(ماخوذ از تفسیرِ عزیزی ج۳ ص۲۵۷)

شبِ قدر کے فضائل:

شبِ قدر شرف وبرکت والی رات ہے، اس کو شبِ قدر اس لیے کہتے ہیں کہ اس شب میں سال بھر کے اَحکام نافذ کیے جاتے ہیں اور فرشتوں کو سال بھر کے کاموں اور خدمات پر مامور کیا جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس رات کی دیگر راتوں پر شرافت و قدر کے باعث اس کو شبِ قدر کہتے ہیں اور یہ بھی منقول ہے کہ چونکہ اس شب میں نیک اعمال مقبول ہوتے ہیں اور بارگاہِ الٰہی میں ان کی قدر کی جاتی ہے اس لیے اس کو شبِ قدر کہتے ہیں۔

اَحادیث میں اس شب کی بہت فضیلتیں وارد ہوئی ہیں، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جس نے اس رات میں ایمان اور اخلاص کے ساتھ شب بیداری کرکے عبادت کی تو اللہ تعالیٰ اس کے سابقہ (صغیرہ) گناہ بخش دیتا ہے۔ (بخاری، کتاب الایمان، باب قیام لیلۃ القدر من الایمان، ۱/ ۲۵، الحدیث: ۳۵)

اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رمضان کا مہینہ آیا تو حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”بے شک تمہارے پاس یہ مہینہ آیا ہے اور اس میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے، جو شخص اس رات سے محروم رہ گیا وہ تمام نیکیوں سے محروم رہا اور محروم وہی رہے گا جس کی قسمت میں محرومی ہے۔

(ابن ماجہ، کتاب الصیام، باب ماجاء فی فضل شہر رمضان، ۲/ ۲۹۸، الحدیث: ۱۶۴۴)

لہٰذا ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ یہ رات عبادت میں گزارے اور اس رات میں کثرت سے اِستغفار کرے، جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے عرض کی: یارسولَ اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم، اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ لیلۃ القدر کون سی رات ہے تو اس رات میں مَیں کیا کہوں ؟ ارشاد فرمایا: تم کہو ”اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ کَرِیمٌ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ“ اے اللہ! بے شک تو معاف فرمانے والا، کرم کرنے والا ہے، تو معاف کرنے کو پسند فرماتا ہے تو میرے گناہوں کو بھی معاف فرمادے۔ (ترمذی، کتاب الدعوات، ۸۴-باب، ۵/ ۳۰۶، الحدیث: ۳۵۲۴)

نیز آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ کونسی رات لیلۃ القدر ہے، تو میں اس رات میں یہ دعا بکثرت مانگوں گی''اے اللہ میں تجھ سے مغفرت اور عافیت کا سوال کرتی ہوں۔ (مصنف ابن ابی شیبہ)

شبِ قدر سال میں ایک مرتبہ آتی ہے :

یاد رہے کہ سال بھر میں شبِ قدر ایک مرتبہ آتی ہے اور کثیر روایات سے ثابت ہے کہ وہ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں ہوتی ہے اور اکثر اس کی بھی طاق راتوں میں سے کسی ایک رات میں ہوتی ہے۔ بعض علما کے نزدیک رمضان المبارک کی ستائیسویں رات شبِ قدر ہوتی ہے اور یہی حضرتِ امام اعظم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

(مدارک، القدر، تحت الآیۃ:۱، ص ۱۳۶۴)

شبِ قدر کو پوشیدہ رکھے جانے کی وجوہات :

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، اللہ عَزَّوَجَلَّ نے شبِ قدر کو چند وجوہ کی بناء پر پوشیدہ رکھا ہے۔

(۱) گویا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، ''اگر میں شبِ قدر کو مُعَیَّن کر دیتا اور یہ کہ میں گناہ پر تیری جرأت کو بھی جانتا ہوں تو اگر کبھی شہوت تجھے اس رات میں گناہ کے کنارے لا چھوڑتی اور تو گناہ میں مبتلا ہو جاتا تو تیرا اس رات کو جاننے کے باوجود گناہ کرنا لاعلمی کے ساتھ گناہ کرنے سے زیادہ سخت ہوتا۔ پس اِس وجہ سے میں نے اسے پوشیدہ رکھا۔

(۲) گویا کہ ارشاد فرمایا میں نے اس رات کو پوشیدہ رکھا تاکہ شرعی احکام کا پابند بندہ اس رات کی طلب میں محنت کرے اور اس محنت کا ثواب کمائے۔

(۳) جب بندے کو شبِ قدر کا یقین حاصل نہ ہو گا تو وہ رمضان کی ہر رات میں اس امید پر اللہ عَزَّوَجَلَّ کی اطاعت میں کوشش کرے گا کہ ہو سکتا ہے کہ یہی رات شبِ قدر ہو۔ (تفسیر کبیر)



از: مولانا تبارک حسین امجدی، سعودی عرب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انوارِ حدیث: غزوۂ اُحد، پس منظر، نتائج

"حَدَّثَنَا أَبُو إِسْحَاقَ، قَالَ: سَمِعْتُ الْبَرَاءَ بْنَ عَازِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، قَالَ " جَعَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الرَّجَّالَةِ يَوْمَ أُحُدٍ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ جُبَيْرٍ، وَأَقْبَلُوا مُنْهَزِمِينَ فَذَاكَ: إِذْ يَدْعُوهُمُ الرَّسُولُ فِي أُخْرَاهُمْ " (صحیح البخاری، ۴۰۶۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں 27 غزوات اور سرایا ہوئے، ان میں سے غزوہ اُحد کا معرکہ ۱۷ شوال ۳ ہجری میں اُحد کے پہاڑ کے عقب میں واقع میدان میں وقوع پذیر ہوا۔

پس منظر: غزوۂ بدر میں شکست کھانے کا کفار کو بڑا رنج و ملال تھا۔ معرکہ بدر میں کفارِ مکہ کو شکست و ہزیمت اور اشراف کے قتل کا جو صدمہ برداشت کرنا پڑا اس کے سبب وہ مسلمانوں کے خلاف غیظ و غضب میں تھے۔ بدر کی شکست کے بعد انہوں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں سے ایک بھرپور جنگ لڑ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کریں اور اپنے جذبہ غیظ و غضب کو تسکین دیں۔ اسی کے ساتھ انہوں نے معرکہ آرائی کی تیاریاں بھی شروع کر دیں۔ اس معاملے میں سردارانِ قریش میں سے عکرمہ بن ابو جہل، صفوان بن اُمیہ، ابو سفیان بن حرب اور عبد اللہ بن ابی ربیعہ زیادہ پرجوش اور پیش پیش تھے۔

اہلِ مکہ کی تیاریاں: اہلِ مکہ نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ ابو سفیان کا وہ قافلہ جو جنگِ بدر کا باعث بنا تھا اور جسے ابو سفیان بچا کر نکال لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا، اس کا سارا مال جنگی اخراجات کے لیے روک لیا اور جن لوگوں کا مال تھا ان سے کہا:

" اے قریش والو! تمھیں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سخت دھچکا لگایا ہے اور تمہارے منتخب سرداروں کو قتل کر ڈالا ہے لہٰذا ان سے جنگ کرنے کے لیے اپنے مال کے ذریعے مدد کرو، ممکن ہے کہ ہم بدلہ چکا لیں۔"

قریش کے لوگوں نے اسے منظور کر لیا۔ چنانچہ یہ سارامال، جس کی مقدار ایک ہزاراونٹ اور پچاس ہزار دینار تھا، جنگ کی تیاری کے لیے بیچ ڈالا۔ پھر انہوں نے رضاکارانہ جنگی خدمت کا دروازہ کھول دیا۔ اس کے علاوہ اہلِ مکہ نے اشعار کے ذریعے لوگوں کی غیرت وحمیت کو جگایا۔ ایک مشہور شاعر ابوعزہ جو جنگ بدر میں قید ہوا تھا اور جس کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ عہد لے کر کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خلاف کبھی نہ اُٹھے گا بلا فدیہ چھوڑ دیا تھا، اس کو صفوان بن اُمیہ نے ابھارا کہ وہ قبائل کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کا کام کرے۔ چنانچہ ابوعزہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کیے ہوئے عہد وپیمان کو بھلا دیا اور ایک بار پھر سے اہلِ مکہ کے جذبات کو ابھارنا شروع کر دیا۔

خواتین کی تیاریاں: خواتین کی جانب سے ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے اپنے گھر پر محفلیں شروع کر دیں جن میں خواتین کو اشعار کے ذریعے جنگ کے لیے ابھارا جاتا جس کے نتیجے میں خواتین نے اپنے زیورات بھی جنگ کی تیاری کے لیے خیرات کر دیئے۔

قریش کا لشکر اور سامانِ جنگ: قریش کی تیاری کو مکمل ہوتے ہوتے ایک سال پورا ہو گیا۔ تمام مشرکینِ مکہ کو ملا کر کل تین ہزار کی فوج تیار ہوئی۔ قائدینِ قریش اس رائے پر متفق ہوئے کہ اپنے ساتھ عورتیں بھی لے چلیں تاکہ حرمت وناموس کی حفاظت کا کچھ احساس ہو۔ لہٰذا پندرہ خواتین بھی قریش کے قافلے میں شامل ہو گئیں جن میں ابوسفیان کی بیوی ہندہ بھی شامل تھی۔ مشرکین کے دستے کی کمان ابوسفیان کر رہا تھا۔

مدینے میں اطلاع اور ہنگامی صورتحال: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ قریش کی اس ساری نقل و حرکت کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ آپ نے تمام تفصیلات ایک قاصد کے ذریعے خط کی صورت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں بھیجی۔ یہ خط حضرت ابی کعب نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پڑھ کر سنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انہیں رازداری برتنے کی تاکید کی۔ اس کے بعد مدینہ منورہ میں ہنگامی صورتحال نافذ کر دی گئی۔ لوگ کسی بھی ناگہانی صورتحال سے نمٹنے ک لیے ہمہ وقت ہتھیار بند رہنے لگے یہاں تک کہ دورانِ نماز بھی ہتھیار جدا نہیں کیے جاتے تھے۔ حضرت سعد بن معاذ، حضرت اسید بن حضیر اور سعد بن عبادہ پر مشتمل یہ مختصر سا دستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نگرانی پر تعینات ہو گیا۔ یہ صحابہ کرام ہتھیار پہن کر ساری ساری رات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دروازے پر گزار دیتے تھے۔ صحابہ کرام کی یہ سنت امت مسلمہ کے لیے ایک سبق ہے

مدینے کی دفاعی حکمتِ عملی کے لیے مجلسِ شوریٰ کا اجلاس:

اس ہنگامی صورتحال کے پیشِ نظر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مجلسِ شوریٰ کا اجلاس منعقد فرمایا اور ممبرانِ شوریٰ کو ایک خواب سنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بتایا کہ میں نے ایک بھلی چیز دیکھی میں نے دیکھا کہ کچھ گائیں ذبح کی جا رہی ہیں اور میں نے دیکھا کہ میری تلوار کے سرے پر کچھ شکستگی ہے اور یہ بھی دیکھا کہ میں نے اپنا ہاتھ ایک محفوظ زرہ میں داخل کیا

ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے گائے کہ یہ تعبیر بتلائی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے گھر کا کوئی آدمی شہید ہو گا اور محفوظ زرہ سے مراد شہر مدینہ ہے۔

صحابہ کرام سے مشاورت اور عبد اللہ بن ابی:

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جنگی حکمت عملی وضع کرنے کے لئے صحابہ کرام سے مشاورت کی۔ اس مشاورتی اجلاس میں انصار اور مہاجر دونوں شامل تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عبد اللہ بن ابیّ رئیس المنافقین کو بھی مدعو کیا۔ عبد اللہ بن ابیّ کو پہلی مرتبہ کسی مشاورت میں شامل کیا گیا تھا۔ اس کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا۔ کچھ صحابہ کرام نے شہر کے اندر رہ کر ہی لڑائی کرنے کا مشورہ دیا کیونکہ اس حکمتِ عملی کے تحت اگر مشرکینِ مکہ اپنے کیمپ میں مقیم رہتے ہیں تو بے مقصد اور برا قیام ہو گا اور اگر مدینے میں داخل ہوتے ہیں تو مسلمان گلی کوچے کے ناکوں پر ان سے جنگ کریں گے یہی صحیح رائے تھی اور رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا لیکن اس کے اتفاق کی وجہ یہ نہ تھی کہ جنگی نقطہ نظر سے یہی درست موقف تھا بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ جنگ سے دور بھی رہے اور اس کے اس قبیح فعل کا کسی کو احساس بھی نہ ہو مگر اللہ پاک کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اللہ پاک اس کی منافقت اور دوغلے پن سے پردہ اُٹھانا چاہتا تھا تاکہ مسلمانوں کو اپنے مشکل ترین وقت میں منافق اور کافر کی پہچان ہو جائے۔ کچھ صحابہ نے، جو بدر میں شرکت سے رہ گئے تھے، بڑھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مشورہ دیا کہ کھلے میدان میں چل کر مقابلہ کیا جائے انہوں نے اپنی رائے پر سخت اصرار کیا۔ ان گرم جوش حضرات میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چچا حضرت حمزہ بن عبد المطلب سرِفہرست تھے۔ آپ معرکہ بدر میں اپنی تلوار کا جوہر دکھا چکے تھے پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے حجرۂ مبارک میں تشریف لے گئے اور زرہ بکتر زیب تن کی اور تلوار تھام کر باہر تشریف لائے۔

اسلامی لشکر کی ترتیب:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے لشکرِ اسلام کو تین حصوں میں تقسیم فرمایا:

1۔ مہاجرین کا دستہ۔ اس کا پرچم حضرت مصعب بن عمیر کو عطا کیا۔

2۔ قبیلہ اوس (انصار) کا دستہ۔ اس کا علم حضرت اُسید بن حضیر کو عطا فرمایا۔

3۔ قبیلہ خزرج (انصار) کا دستہ۔ اس کا عَلَم حباب بن مُنذِر کو عطا فرمایا۔

اسلامی لشکر ایک ہزار (۱۰۰۰) مردانِ جنگی پر مشتمل تھا جن میں ایک سو زرہ پوش اور پچاس شہسوار تھے۔ حضرت اُمِّ مکتوم کو اس کام پر مقرر فرمایا گیا کہ وہ مدینے کے اندر رہ جانے والے لوگوں کو نماز پڑھائیں گے۔

اُحد اور مدینے کے درمیان شب گزاری:

اُحد اور مدینہ کے درمیان "شیخان" نامی ایک مقام پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے رات گزارنے کا حکم فرمایا ۔ پہرے کے لئے پچاس صحابہ کرام کو منتخب کیا گیا جو کیمپ کے ارد گرد گشت کرتے رہتے تھے۔ ان کے قائد محمد بن مسلمہ انصاری تھے۔

عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھیوں کی سرکشی:

طلوع فجر سے کچھ پہلے قافلہ چل پڑا اور پھر مقام "اشواط" پہنچ کر نمازِ فجر ادا کی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دشمن کے بالکل قریب تھے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عبد اللہ بن اُبی رئیس المنافقین نے بغاوت کر دی اور ایک تہائی لشکر یعنی تین سو افراد کو لے کہ یہ کہتا ہوا واپس چلا گیا کہ اس کی بات نہیں مانی گئی اور دوسروں کی بات مان لی۔ یقیناً اس کی علیحدگی کا سبب وہ نہیں تھا جو اس منافق نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کی بات نہیں مانی۔ اگر یہ وجہ ہوتی تو وہ مدینہ منورہ سے مقام اشواط تک کبھی نہ آتا بلکہ وہیں سے الگ ہو جاتا بلکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ اس نازک موڑ پر الگ ہو کر اسلامی لشکر میں ایسے وقت اضطراب اور کھلبلی مچانا چاہتا تھا جب دشمن اس کی ایک ایک نقل و حرکت دیکھ رہا تھا تاکہ اسلامی لشکر کے حوصلے ٹوٹ جائیں اور دوسری طرف یہ منظر دیکھ کر کفار کی ہمت بندھ جائے لہٰذا یہ کاروائی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور ان کے مخلص ساتھیوں کے خاتمے کی ایک تدبیر تھی جو اس منافق نے اپنائی اور اس کے کفر و نفاق سے اللہ پاک نے پردہ اُٹھا دیا۔

غزوۂ احد میں منافق کی اس حرکت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا:

ترجمہ: اور ایسے لوگوں کی بھی پہچان کرادے جو منافق ہیں اور جب ان سے کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا (وضاحتاً کہا گیا کہ دشمن کے حملے کا) دفاع کرو تو کہنے لگے اگر ہم جانتے کہ (واقعتاً) لڑائی ہوگی (یا ہم اسے اللہ کی راہ میں جنگ جانتے) تو ضرور تمہاری پیروی کرتے، اس دن وہ (ظاہری) ایمان کی نسبت کھلے کفر سے زیادہ قریب تھے، وہ اپنے منہ سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہیں اور اللہ (ان باتوں) کو خوب جانتا ہے جو وہ چھپا رہے ہیں۔ (سورہ آلِ عمران۔167)

اس کے بعد اسلامی لشکر کی تعداد 700 رہ گئی۔

اس منافق کی یہ حرکت دیکھ کر مزید دو جماعتوں یعنی قبیلہ اوس میں سے بنو حارثہ اور قبیلہ خزرج میں سے بنو سلمہ کے قدم بھی لڑکھڑا چکے تھے اور وہ واپسی کی سوچ رہے تھے لیکن اللہ پاک نے ان کی دستگیری کی اور یہ دونوں جماعتیں اضطراب اور ارادہ واپسی سے باز رہیں۔ انہیں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے سورہ آلِ عمران، آیت 122 میں ارشاد فرمایا:

ترجمہ: اور جب تم میں سے دو جماعتوں نے فیصلہ کیا کہ بزدلی اختیار کریں اور اللہ ان کا ولی ہے اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

دفاعی منصوبہ: اُحد کے مقام پر پہنچ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لشکر کی ترتیب و تنظیم فرمائی اور جنگی نقطۂ نظر سے اسے کئی صفوں میں تقسیم فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صف بندی اس بہترین انداز میں فرمائی کہ جبلِ احد لشکر کی پشت پر تھا اور دشمن سامنے۔ تاہم پیچھے کی طرف ایک گھاٹی ایسی تھی جہاں سے دشمن اچانک حملہ آور ہو سکتا تھا۔

ماہر تیر اندازوں کا دستہ: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بہترین جنگی حکمتِ عملی کے تحت ماہر تیر اندازوں کا ایک دستہ منتخب کیا جو پچاس صحابہ کرام پر مشتمل تھا۔ اس دستے کی کمان حضرت عبد اللہ بن جبیر (انصاری) کے سپرد کی اور وادی قناۃ کے جنوبی کنارے پر واقع اس گھاٹی پر تعینات کیا جس کے ذریعے کفار مسلمانوں پر حملہ آور ہوسکتے تھے۔ جب صحابہ کرام کا مستعد دستہ اس پہاڑی پر اپنے فرائض کی غرض سے تعینات ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیر اندازوں کو ہدایات دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ”شہسواروں کو تیر مار کر ہم سے دور رکھو۔ ہم جیتیں یا ہاریں تم اپنی جگہ پر ڈٹے رہنا۔“ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیر اندازوں کو مخاطب کر کے یہ حکم دیا کہ "دیکھو ہم چاہے مغلوب ہوں یا غالب مگر تم لوگ اپنی اس جگہ سے اس وقت تک نہ ہٹنا جب تک میں تمہارے پاس کسی کو نہ بھیجوں۔" ان سخت احکامات کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خطاب کا اختتام فرمایا۔ اس جنگی منصوبہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فوجی قیادت کی صلاحیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت زُبیر بن عوام کو یہ مہم سونپی گئی کہ وہ خالد بن ولید (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) کے شہسواروں کی راہ روکیں گے۔

جنگ کا آغاز: دونوں جماعتیں آمنے سامنے آگئیں سب سے پہلے کفار کی جانب سے علمبردار طلحہ بن ابی طلحہ عبدری میدان میں اترا اور اسلامی صف سے حضرت زبیر آگے بڑھے اور ایک ہی جست میں اس مشرک کا کام تمام کر کے اسے واصلِ جہنم کر دیا۔ اس کے بعد گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ کفار کا علم طلحہ بن ابی طلحہ کی ہلاکت کے بعد اس کے بھائی عثمان بن ابی طلحہ نے تھام لیا، اس شخص پر حضرت حمزہ بن عبد المطلب نے حملہ کیا اور تلوار کے ایک ہی وار سے اس کے بازو کو تن سے جدا کر دیا۔ پھر میدان میں قتل و خونریزی شروع ہو گئی۔ اسلامی صفوں میں عشقِ رسول کی شمع روشن تھی اس لیے وہ اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر کافروں کو جہنم رسید کر رہے تھے۔ جبل رماۃ پر جن تیر اندازوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعین فرمایا تھا انہوں نے بھی جنگ کی رفتار مسلمانوں کے موافق چلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے خالد بن ولید کے شہسواروں کو روکے رکھا۔ کچھ دیر جنگ اسی طرح جاری رہی اور مسلم لشکر مشرکین کی بھاری فوج پر حاوی رہا اور مشرکین کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ مسلمانوں کے سات سو کے لشکر نے کفار کے تین ہزار کے دستہ کو تھکا کر رکھ دیا اور صواب (مشرکین کا علمبردار) کے قتل کے بعد کفار ہمت ہار گئے اور پسپا ہو کر راہ فرار اختیار کرنا شروع کر دی۔ اسلامی تاریخ کے اوراق میں ایک اور شاندار فتح کے الفاظ ثبت ہونے والے تھے۔

تیر اندازوں کی غلطی: جیسے ہی کفار میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے تو مسلمانوں نے مال غنیمت اکٹھا کرنا شروع کر دیا گویا یہ اشارہ تھا کہ ہم فتح یاب ہو گئے ہیں۔

گھاٹی پر تعینات تیر اندازوں نے جب یہ دیکھا کہ مسلم لشکر مالِ غنیمت اکٹھا کرنے میں مصروف ہو گئے ہیں تو وہ پچاس تیر انداز مسلمان جو درہ کی حفاظت پر مقرر کئے گئے تھے وہ بھی آپس میں ایک دوسرے سے یہ کہنے لگے کہ غنیمت لوٹو، غنیمت لوٹو، تمہاری فتح ہو گئی۔ ان لوگوں کے افسر حضرت عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہر چند روکا اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فرمان یاد دلایا اور فرمانِ مصطفوی کی مخالفت سے ڈرایا مگر ان تیر انداز مسلمانوں نے ایک نہیں سنی اور اپنی جگہ چھوڑ کر مال غنیمت لوٹنے میں مصروف ہو گئے۔ پہاڑی پر صرف حضرت عبد اللہ بن جبیر کے علاوہ نو صحابہ رہ گئے جو ڈٹے رہے۔

اسلامی لشکر پر اچانک حملہ: خالد بن ولید نے جب مسلمانوں کو پہاڑی سے اترتے دیکھا تو اس سنہرے موقع کو ضائع نہ کیا اور اسلامی لشکر کی پشت پر جا پہنچے۔ پہاڑی پر موجود صحابہ کو شہید کرتے ہوئے میدان میں اتر آئے۔ مشرکین نے جب خالد بن ولید کو دیکھا تو وہ بھی مسلمانوں کے گرد اکٹھا ہونا شروع ہو گئے، اب مسلم فوج ہر طرف سے گھر چکی تھی۔ مشرکینِ مکہ کی نظر جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر پڑی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے طرف لپکے۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ نو صحابہ کرام تھے۔ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پھیل گیا، مسلمانوں کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور ایک جیتی ہوئی جنگ وقتی شکست میں تبدیل ہو گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جب مشرکین کے ہاتھوں مسلمانوں کو شہید کرتے دیکھا تو بلند آواز میں فرمایا "لوگو! ادھر آؤ" یعنی کفار کو اپنی جانب بلانا چاہا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بطور مرشد اپنے صحابہ کی جان بچانے کی خاطر اپنی مبارک جان کو مشرکین کے حوالے کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ حتیٰ کہ اہلِ مدینہ میں یہ بات بھی پھیل گئی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم شہید ہو گئے ہیں۔ (نعوذ باللہ)

در حقیقت حضرت مصعب بن عمیر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ حضرت مصعب بن عمیر کی شکل وصورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بہت مشابہ تھی، اس لیے کفار یکایک پکارنے لگے کہ محمد قتل کر دیئے گئے ہیں (نعوذ باللہ)۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شہادت کی خبر سنتے ہی صحابہ کرام کے حوصلے پست ہو گئے اور بعض تو میدانِ جنگ سے ہی روانہ ہو گئے لیکن بعض صحابہ کرام مزید جرأت و شجاعت سے لڑے کہ جس عظیم مقصد کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم شہید ہو گئے ہمیں بھی اس مقصد کے لیے اپنی جان قربان کر دینی چاہیے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جانثاروں کی جرأت و شجاعت کے باوجود اب شکست یقینی نظر آ رہی تھی کہ اتنے میں حضرت کعب بن مالک نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دیکھا اور دیکھتے ہی پکار اٹھے "مبارک ہو! یہ ہیں حضور"۔ یہ سننا تھا کہ منتشر صحابہ کرام ہر

طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جانب دوڑے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے گرد حصار بنالیا۔ مشرکینِ مکہ صحابہ کرام کو ایک مرتبہ پھر متحد ہوتا دیکھ کر بھاگ نکلے۔

اس غزوہ کے آغاز میں مسلمان اپنی تعداد پر نازاں تھے۔ ان کا توکل اللہ کی ذات کے علاوہ اپنے ساز وسامان اور تیاری پر تھا۔ اس لیے مسلمانوں کی اصلاح کے لیے اللہ پاک کی طرف سے یہ عارضی شکست ضروری تھی۔ لیکن جب مسلمانوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دوبارہ پکارنے پر اپنی ہمتوں کو جمع کیا اور واپس پلٹے تو اللہ تعالیٰ نے بھی مدد فرمائی اور مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔

ایک اہم نصیحت: غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو شدید آزمائشوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس معرکے میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عظیم چچا حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ سمیت ستر (70) جلیل القدر صحابۂ کرام شہادت کے عظیم مرتبے پر فائز ہوئے۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تیر اندازوں کو یہ ہدایت فرمائی تھی کہ " : ہم چاہے غالب ہوں یا مغلوب، تم لوگ اپنی اس جگہ سے ہرگز نہ ہٹنا جب تک میں تمہارے پاس کسی کو نہ بھیجوں۔ " لیکن اس ارشادِ عالی شان کے باوجود کچھ تیر انداز حضور ﷺ کے حکم اور بلانے سے پہلے ہی پہاڑی سے نیچے اتر آئے۔ اس کے نتیجے میں جنگ کا نقشہ بدل گیا؛ جیتی ہوئی جنگ وقتی طور پر شکست میں بدل گئی اور مسلمانوں کو سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

لہٰذا اس واقعے میں تمام اہلِ ایمان کے لیے ایک عظیم نصیحت پوشیدہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے احکام کی کامل اطاعت ہی حقیقی کامیابی کی ضمانت ہے، جبکہ معمولی سی نافرمانی بھی بڑے نقصان اور آزمائش کا سبب بن سکتی ہے۔



پیش کش: سیدہ غوثی

درس تصوف

نسخۂ کیمیا

قدوۃ الاولیاء، زبدۃ الاصفیاء، شیخ المشائخ حضرت علامہ خواجہ سید شاہ مسعود اصدق کمال غوثی شہودی چشتی قادری رضی اللہ عنہ عارف باللہ، غوث وقت، شہود ثانی حضرت خواجہ سید شاہ غلام غوث شہودی اصدقی چشتی قادری قدس سرہ العزیز کے خلف اکبر وجانشین تھے۔ اللہ تبارک وتعالی نے آپ کو مجمع الفضائل والکمالات بنایا تھا۔ آپ اپنے آپ میں شریعت وطریقت کا حسین امتزاج تھے۔ عالم باعمل ہونے کے ساتھ ساتھ معرفت الہیہ کے غواص بزرگ تھے۔ آپ نے ۱۶ شوال المکرم ۱۴۰۸ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے مالک حقیقی کے جوار رحمت میں پہنچ گئے۔ آپ کا مزار مبارک ہندوستان کے تاریخی شہر سہسرام میں مرجع خلائق ہے۔ ۱۶ شوال المکرم آپ کے وصال کی تاریخ ہے اس مناسبت سے آپ کا ایک روحانی مکتوب ہدیۂ قارئین ہے جس میں تصوف کی تعلیمات کا ایک جہاں آباد ہے۔ اس مکتوب سے جہاں حضرت کمال غوثی علیہ الرحمہ کی عظمت وشان کا علم ہوتا ہے وہیں پڑھنے والے کے نفس کا تزکیہ اور اس کے باطن کی اصلاح بھی ہوتی ہے۔ اللہ ورسول کی تعلیمات وارشادات پر عمل کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ دل ودماغ نور عرفان سے جگمگانے لگتا ہے۔ گم گشتگان راہ کو نشان منزل نصیب ہوتی ہے اور سالک کے لیے وصول الی اللہ کی منزل آسان ہوجاتی ہے۔ ذیل میں حضرت قدس سرہ العزیز کا وہ روحانی مکتوب ملاحظہ کریں۔

عزیزم محمد شفیع غوثی اصدقی سلمہ اللہ الملک المنان۔۔۔۔۔۔۔ دعا وسلام مسنون

آج آپ کا مرسلہ لفافہ ملا جس سے معلوم ہوا کہ علاج کا خرچ بھیجا گیا ہے اور بہت سختی کے ساتھ سنتِ نبوی کی پیروی کی تاکید ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا اور آپ کے ساتھی قلم اور آپ کے جذبۂ دل کا دونوں جہاں میں بھلا کرے۔

اب اتنی زبردست تاکید اور مالی رعایت کے باوجود کس کی مجال کہ سنت کی پیروی میں کوتاہی کرے۔ فوراً اس حکم کی تعمیل کے لیے سرکاری ڈاکٹر کی طرف رجوع کیا۔ معلوم ہوا کہ وہاں بڑی بھیڑ ہے، تیرے جیسے نادار مریضوں کا گزر نہیں۔ ہمت نے کہا نالہ وفریاد کے دھماکے سے ڈاکٹر کو مخاطب کیجیے، اسی سے کام لیتے ہوئے کہا

تیرے عاشق کی طبیعت ایسی کچھ ناساز ہے
بچ نہیں سکتا بہت بگڑا ہوا انداز ہے
آ گھڑی پر دیکھ جا، مانا کہ تو غماز ہے

دیکھیے کس لطف سے پوشیدہ غم کا راز ہے
تیر میرے دل میں ہے، پردے میں تیر انداز ہے

ڈاکٹر نے کہا: اس نے سارے شفاخانے کو سر پر اٹھالیا ہے، اسے بلالو، ورنہ پورے شفاخانے والوں کی زندگی خطرے میں ڈال دے گا۔ خدا خدا کر کے شفاخانے میں طلب کیا گیا۔ بھلا سرکاری شفاخانہ اور چھوت کا مرض مہلک! ڈاکٹر حیران رہ گیا۔ کہا: معائنہ کیا جائے گا۔ دم لے، اطمینان سے رہ، شور و غوغانہ کر، ورنہ ہوش ٹھکانے کر دیا جائے گا۔ مارے ڈر کے چپ سادھی اور معالج دوسری طرف متوجہ ہوا۔ کچھ دیر کے بعد پکار ہوئی۔ کانپتا ہوا معالج کے نزدیک گیا۔ بھیڑ میں کمی نہ تھی۔ بڑی آرزو و منت سے عرض کی۔

میں مریضِ عشق ہوں، میری دوا پردے میں ہو
نامرادِ وصل ہوں، میری دوا پردے میں ہو

معالج نے کہا: تو یہ سب کیا بکتا ہے؟ میں تیرا ایکسرے کروں گا۔ جو چاہو بابا کر لو۔ فقیر تو پیرویِ سنت کرنے ہی کے لیے یہاں تک زبردستی بھیجا گیا ہے۔ اب تم بھی کرو، میں بھی کروں۔ بٹن دبایا، ایکسرے ہو گیا۔ اس نے کہا: تمہارا ایکسرے ہو گیا۔ جوں ہی میں کچھ بولنا چاہا، اس نے مجھے ڈانٹ کر خاموش کر دیا اور کہا: خاموشی سے سنت کی پیروی کر تارہ، ورنہ ڈنڈوں کے ذریعے فرض پورا کیا جائے گا۔ میں چپ ہو گیا۔

اب ایکسرے کی رپورٹ بتائی گئی:

"تیرا دماغ سودائی ہے، دل میں ناسور ہے، قلب کے ہر دروازے سے شیاطین کھڑے جھانکتے ہیں۔ زخمِ جگر پک چکا ہے۔ بغیر آپریشن کے بچنا محال ہے۔ دل کا، دماغ کا، جگر کا، یوں سمجھ کہ جسم و جان کی رگ رگ کا آپریشن کیا جائے گا، تو ممکن ہے تیری جان سلامت بچ سکے۔"

میں نے ڈرتے ہوئے پوچھا کہ سرکاری شفاخانے میں ایسا آپریشن پہلے بھی ہوا؟ بولا کہ ایسا آپریشن بے شمار یہاں ہر وقت کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ تجھ جیسا مریض بے شمار روزانہ ہی نہیں بلکہ ہر لمحہ یہاں آتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اب تک جو بھی آیا بڑی آسانی کے ساتھ اسے فنا کے گھاٹ اتار دیا گیا اور ایک مریض بھی یہاں سے جان سلامت لے کر واپس نہیں گیا۔

میں نے کہا کوئی ایسی صورت بتاؤ کہ جان بچے۔ کہا اچھا ایک ترکیب بتاتا ہوں، جان بچ جائے گی، مگر سختی کے ساتھ میرے کہنے پر عمل کرنا ہو گا۔ میں نے کہا ضرور کروں گا۔ تب اس نے بتایا کہ:

"خیالِ یار کو دماغ سے اور یادِ دوست کو دل سے نکال پھینک، اور کبھی بھولے سے تذکرۂ محبوب نہ کر اور نہ سن۔ چل دور ہو، صحت ہو جائے گی۔"

میں نے کہا: سرکار! یہ بات تو اپنے بس کی نہیں۔ کوئی دوسرا نسخہ تجویز کرو اور آپریشن سے بچا دو۔ اب مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگا اور کہا: تو سودائی بڑا سیانا معلوم ہوتا ہے، کام کا ہوشیار، مجنوں نام کا۔ اچھا سن! تیرے مرض کا لاجواب نسخہ بے خطا دواؤں کا ایک مرکب لکھ دیتا ہوں۔ اسے تیار کرا لے اور استعمال کر، پورا فائدہ ہو گا، صحتِ کلی ہو گی۔ یہ لے اور جا۔ دوبارہ یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔

غرض کہ سرکاری شفاخانے سے ڈاکٹر بابو نے جو نسخہ تجویز کر دیا میں اسے آپ کے پاس بھیج رہا ہوں جو بالکل کم قیمت اور بالا نشیں ہے۔ اس کا حصول آسان، بنانا کٹھن نہیں۔ کوئی محنت نہیں، کچھ وقت نہیں لگتا۔ بے محنت دم کے دم میں نسخہ تیار ہو جائے گا۔ آپ تیار کر لیں اور شاید اتنا مختصر وقت بھی آپ نسخہ کی تیاری میں نہ لگا سکیں تو اپنے بھائی کے ذمہ لگا دیجیے۔ وہ بڑی آسانی سے قرینہ اور گرم پانی کا سہارا لے کر، دھڑلے سے جھوٹ بیچ کر معجون تیار کر لے گا، اس لیے کہ اس کام میں اس کو بڑی مہارت اور بڑی مشاقی ہے۔ وہ گاہے فرش پر اور گاہے عرش پر کونہ کونہ جھانکتا پھرتا ہے اور بگڑی بات بنا لیتا ہے۔

ابھی تو وہ سنت کی پیروی کرا رہا ہے، کل فرض پورا کرانے لگے گا تو پھر کہاں ٹھکانہ رہے گا۔ ابھی سے اس خیال نے ہوش ٹھکانے لگا دیے ہیں۔ بہرحال اب تو سنت کی پیروی کرنے کی میں نے بھی ٹھان لی ہے۔

نسخہ حسبِ ذیل ہے: آپ اسے خود تیار کر لیں یا بھائی کی خدمتِ شریف میں پیش کر کے تیار کرا کے بذریعہ ڈاک ہمارے پاس جلد از جلد روانہ کریں تاکہ میں بے تاخیر استعمال کروں اور کراؤں اور صحتِ کلی حاصل ہو جائے اور سنت کی پیروی آسان ہو جائے۔

نسخہ

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

(۱) کذب (۲) حرص (۳) حسد (۴) کینہ (۵) بغض (۶) غرور (۷) غیبت (۸) نفاق (۹) ریا (۱۰) بخل جتنی مقدار میں دستیاب ہو جائے لے لو اور عصیاں کے ٹوکرے میں سب کو جمع کر لو۔ علم کے ہاون میں سب کو ڈال کر عمل کے دستے سے خوب کوٹو اور تھوڑی تھوڑی دیر پر اشکِ ندامت کا پٹ دیتے رہو۔ بعد ازاں یقین کی ہانڈی میں رکھ کر اطمینان و صبر کے چولہے پر چڑھا کر عشق کی آنچ تیز کر دو کہ دوا خوب کھولنے لگے۔

رضا کے چمچے سے کم از کم ایک لاکھ چوبیس ہزار بار چلاتے رہو کہ سانس کی ہر آمد و رفت میں صدائے **اللہ** بر آمد ہونے لگے۔ پھر عقل کی ہوا سے ٹھنڈا کر کے فکر اور تدبیر کی چاشنی ملا دو۔ سب ایک ذات ہو جائے تو حیا کی کڑاہی میں رکھ کر طہارت کے پانی سے خوب دھو ڈالو۔

پھر شریعت کی چادر پر پھیلا کر خشک کر لو۔ جب تک "**میں** " اور "**تو** " کی مہک باقی رہے طریقت کی چھاؤں میں سکھاتے رہو، یہاں تک کہ "**میں** " کی مہک غائب ہو اور "**تو**" ہی "**تو** " رہ جائے۔ پھر صفا کی تھیلی میں بھر کر دریائے حقیقت میں غوطہ دے کر معرفت کے طشت میں پھیلا دو۔

طہارت کی انگلی سے شرعِ شریف کی زبان پر رکھ کر اس کا ٹیسٹ کرو۔ چشمِ یقین سے دیکھو، حق الیقین سے سمجھو۔ دل کے پٹ کھول کر اس کی آواز پر کان لگا کر صوتِ سرمدی کی آواز کو پہچانو۔ جب یہ آواز زور زور سے آنے لگے تو **کلمۂ لاالٰہ الا اللہ** کی کسوٹی پر پرکھو۔

یہاں تک کہ وصل **محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم** ہو جائے۔ تب ریاضت کی شکر سہ چیچ ملا دو اور درمیانی حجابات کو دور کر کے عمرِ نوح کی قلیل مدت کو ختم کر دو۔ اب نہ "**میں** " کی مہک رہے گی اور نہ "**تو** " کی۔

اے عزیز! اب اس دوا کے خواص لکھنا مناسب نہیں۔ کسی غیر کا ہاتھ اس نسخہ پر نہ پڑے، اس لیے کہ سرکاری شفاخانے سے سرکاری سرجن نے عطا فرمایا ہے۔ اس میں یقینی شفا ہے۔ اس کی ایک خوراک حلق سے اترتے ہی مردے کو زندہ کرے گی اور زندوں کو دائمی زندگی بخشے گی۔

اس دوا کے ہوتے ہوئے کسی دوا کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ پاؤں پر گرم پانی پڑے یا سر پر برف گرے یا کچھ بھی ہو، پرواہ نہیں۔ اس لیے کہ ہمارے پاس سرکاری شفاخانے کا عطیہ نسخہ کا مرکب تیار موجود ہے۔

ابا، اماں، بھائی، بیٹا، بہن، بیوی، دوست، دشمن — بس مرض خواہ کچھ بھی ہو، دوا کا ایک چمچہ صحتِ کلی کا ضامن ہے۔ جلد بنا کر بھیج دیں۔ مجھے انتظار رہے گا۔

چونکہ آپ لوگوں کو ہماری گرتی ہوئی صحت دیکھ کر پریشانی بڑھتی جا رہی ہے اور علاج کا مشورہ بار بار دیا جا چکا ہے، میں نے بھی غور کیا کہ کچھ نہ کیا، نہ کر سکا، عمر کو مفت کھو دیا۔ اب بھی تو کچھ کر لو کہ جامِ حیات پر ہونے والا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اچانک پروانۂ حیات کٹ جائے اور زندگی کی آنے والی بہاروں سے محروم ہونا پڑے۔

خدا کا شکر ہے فریاد کام آئی، سرکاری شفاخانہ کھلا، اپنی رسائی ہوئی، حالتِ زار پر سرجن کو ترس آیا اور حیاتِ ابدی کا نسخہ عطا فرما کر ہم پر اور ہماری اولادِ ظاہری و باطنی پر تا قیامِ قیامت احسان فرمایا۔

اللہ اس کا اور بھی رتبہ بلند ہو
جس نے کہ میرے گھر کو خدا خانہ کر دیا

میرے عزیزو! میں بھی سنت کی پیروی میں اسی دوا کا انتظار کرتا ہوں۔ آپ لوگ بھی اس پیروی کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ خدا اجرِ عظیم بخشے۔ آمین۔

زیادہ دعا، فقط: کمال غوثی



دینی مسائل

مفتی سید شہباز اصدق غوثی

شوگر کے مریض کے لیے روزہ کا حکم

سوال: میں سالوں سے شوگر کا مریض ہوں، شوگر بہت زیادہ رہتا ہے۔ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ روزہ نہ رکھیں۔تو اب ایسی صورت میں میرے لیے شریعت کا کیا حکم ہے؟۔ محمد احمد (ڈربن)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡجَوَابُ بِعَوۡنِ الۡمَلِکِ الۡوَھَّابِ

جس شخص کو ایسا دائمی مرض ہو جس سے شفا کی امید بظاہر نہ ہو اور روزہ رکھنے سے اسے ضرر ہو گا یا مرض بڑھے گا اور یہ امر تجربہ سے ثابت ہو یا کسی مسلمان غیر فاسق ماہر ڈاکٹر نے کہا ہو تو ایسی صورت میں وہ شخص شرعا معذور قرار پائے گا اور اس کے لیے روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہو گی۔ ایسا شخص روزہ نہ رکھے اور فدیہ دے کہ دائمی معذور کے لیے فدیہ ہے۔یعنی ہر روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو دو وقت کا کھانا کھلائے یا اپنے اوسط معیار کے مطابق دو وقت کے کھانے کے لیے نقد رقم دے دے۔ردالمحتار میں ہے:"و للشیخ الفانی العاجز عن الصوم الفطر و یفدی) و جوباً و لو فی اول الشھر و بلا تعدد فقیر " (ردالمحتار علی الدر المختار۔ج3ص365)

یعنی: ایسا بوڑھا شخص جو روزہ رکھنے سے عاجز ہو اسے روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے اور ہر روزہ کا فدیہ اس پر واجب ہے۔خواہ مہینے کے ابتدا ہی میں دیدے اور فدیہ دینے میں فقرا کی کوئی خاص تعداد شرط نہیں ہے۔

پھر اگر اللہ تبارک و تعالی کے بے پایاں احسان سے وہ شفایاب ہو جائے تو فدیہ صدقہ نافلہ ہو جائے گا اور اس پر ان چھوڑے ہوئے روزوں کی قضا لازم ہو گی۔سیدی اعلی حضرت امام احمد رضا قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں :

"جو ایسا مریض ہے کہ روزہ نہیں رکھ سکتا، روزہ سے اسے ضرر ہوگا، مرض بڑھے گا یا کھچیں گے، اور یہ بات تجربہ سے ثابت ہو یا مسلم طبیب حاذق کے بیان سے جو فاسق نہ ہو تو جتنے دنوں یہ حالت رہے اگرچہ پورا مہینہ، وہ روزہ ناغہ کر سکتا ہے اور بعد صحت اس کی قضا رکھے، جتنے روزے چھوٹے ہوں ایک سے تیس تک"۔ (فتاوی رضویہ۔ج10ص520)

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ عَزَّوَجَلَّ

وَرَسُوْلُه اَعْلَم صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَاٰلِه وَسَلَّم

وہ پانچ ایام جن میں روزہ رکھنا منع ہے

سوال: وہ پانچ ایام کون سے ہیں جن میں روزہ رکھنا ممنوع ہے اور یہ بھی بتادیجیے کی اس کی وجہ کیا ہے؟

فرحانہ اکبر۔(جوہنس برگ)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

اَلْجَوَابُ بِعَوْنِ الْمَلِكِ الْوَهَّابِ

عید الفطر، عید الاضحی اور گیارہ، بارہ، تیرہ ذی الحجہ ان پانچ دنوں میں روزہ رکھنا حرام ہے۔ صحیح مسلم شریف کی حدیث ہے نبی آخر الزماں ارواحنا فداہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا، قَالَتْ: "نَهَى رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ صَوْمَيْنِ: يَوْمِ الْفِطْرِ، وَيَوْمِ الْأَضْحَى" (صحیح مسلم، بَابُ النَّهْيِ عَنْ صَوْمِ يَوْمِ الْفِطْرِ وَيَوْمِ الْاَضْحَى) حضرت عائشہ صدیقہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عید الفطر اور عید الاضحی ان دو دنوں کے روزوں سے منع فرمایا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عید الفطر اور عید الاضحی کے دن روزہ رکھنا منع ہے۔ اسی طرح ایام تشریق یعنی گیارہ، بارہ، تیرہ ذی الحجہ کو روزہ رکھنا بھی ممنوع ہے۔ اسی صحیح مسلم میں امام مسلم رحمہ اللہ نے ایک باب قائم کیا ہے "بَابُ تَحْرِيمِ صَوْمِ أَيَّامِ التَّشْرِيقِ" اس باب کے تحت درج ذیل حدیث کی تخریج کی ہے، جس سے ایام تشریق میں روزہ رکھنے کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ حدیث شریف ہے: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «أَيَّامُ التَّشْرِيقِ أَيَّامُ أَكْلٍ وَشُرْبٍ» یعنی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایام تشریق کھانے پینے کے ایام ہیں۔

صدر الشریعہ حضرت علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: مکروہ تحریمی جیسے عید اور ایام تشریق کے روزے۔

(بہار شریعت، ج1، حصہ5، ص967)

اب رہا یہ سوال کہ ان ایام میں روزہ سے منع کرنے کی حکمت کیا ہے؟ تو اس سلسلے میں سیدی صدر الشریعہ حضرت علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں: عید الفطر ماہ رمضان کے بعد ہوتی ہے اگر آج بھی روزہ رکھا تو فرق ہی کیا رہے گا، اس لیے شرع مطہر نے روزہ کی ممانعت کی تا کہ اس کو ما قبل سے ممتاز کیا جائے اور رمضان کے فریضہ ادا کرنے کی خوشی کی جائے اور کھایا پیا جائے اور عید الاضحی قربانی کا دن ہے اس روز قربانی کی جائے اور اس کا گوشت کھایا جائے۔ (فتاوی امجدیہ ج1 ص395)

وَاللهُ اَعْلَمُ عَزَّوَجَلَّ

وَرَسُوْلُہ اَعْلَم صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّم

عید کے شش روزے بعد عید مسلسل رکھنے ہیں؟

سوال: عید کے 6 روزہ کی بہت بڑی فضیلت ہے مجھے یہ جاننا ہے کہ یہ چھ روزے عید کے بعد مسلسل بلاناغہ رکھنا ضروری ہے یا شوال المکرم کے پورے مہینے میں کبھی بھی چھ روزے رکھنے سے یہ ثواب حاصل ہو گا؟

ڈاکٹر محمد منصور

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْجَوَابُ بِعَوْنِ الْمَلِكِ الْوَهَّابِ

شوال المکرم کے چھ روزوں کی عظیم فضیلتیں احادیث میں بیان ہوئی ہیں چنانچہ حضرت سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم فرماتے ہیں: "جس نے رمضان کے روزے رکھے پھر چھ دن شوال میں رکھے تو گناہوں سے ایسے نکل گیا جیسے آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔" (المعجم الاوسط الحدیث 8622)

اس حدیث شریف سے شوال کے چھ روزوں کی فضیلت بھی معلوم ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان چھ روزوں کو مسلسل رکھنے کا ارشاد نہیں ہوا ہے بلکہ فقط اس ماہ میں چھ روزے رکھنے کی تعلیم ہے اب خواہ وہ مسلسل ہوں یا متفرق طور پر۔

اس مقام پر علما نے فرمایا کہ عید کے چھ روزے متفرق یعنی الگ الگ شوال کے متفرق ایام میں رکھے جائیں تو بہتر ہے اور اگر عید کے بعد چھ دن مسلسل روزے رکھ لیے جب بھی کوئی حرج نہیں۔ دونوں صورتوں میں روزہ رکھنے والا حدیث میں مذکور ثواب کا مستحق ہو گا۔



یتیموں پر حضور اکرم ﷺ کی شفقت ورحمت

از: مفتی غلام محی الدین وانی علیمی، اڈیسہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس میں قطعاً شک کی گنجائش نہیں کہ اسلام نے جس معاشرے کی بنیاد ڈالی وہ ایک آفاقیت تھی، ہمہ گیریت تھی اور جس سے ایک ستھرے سماج کو متصور کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی سماج میں جس طرح عام بچے ہیں اسی طرح یتیم اور لاوارث بچے بھی ہیں، مگر عام بچوں کی بہ نسبت یتیم اور لاوارث بچوں کی کفالت کی ذمہ داری معاشرے کے افراد پر بھی لازم ہے۔ جبکہ عام بچے اپنے والدین کے زیرِ سایۂ عاطفت پرورش پاتے ہیں۔ ان کے لیے نظامِ شریعت یہ ہے کہ ان کی ساری ذمہ داری والدین کی ہوتی ہے، جب کہ یتیموں کی پرورش و پرداخت کے لیے معاشرے کے دیگر افراد کو بھی ترغیب دی گئی ہے۔ اس کے لیے ان لوگوں کو، جن کے زیرِ کفالت یتیم و نادار بچے ہیں، ثوابِ دارین کی ترغیب دی گئی ہے اور اس کے اجر و ثواب کا ان لوگوں کو مستحق مانا گیا ہے جو یتیم کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں۔

کیونکہ حضور رحمۃ للعالمین بن کر تشریف لائے۔ قرآنِ کریم میں اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے:

"وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ" (الانبیاء107)

ترجمہ: "اور ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہان کے لیے۔"

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم شفیقِ اعظم ہیں۔ آپ کی شفقت و محبت نہ صرف یہ کہ انسان، جنات اور حیوانات ہی کو حاصل ہے بلکہ تمام مخلوقات کے لیے ہے۔ لہٰذا اس مختصر مضمون میں ہم آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی یتیموں پر شفقت کے متعلق قرآنِ کریم کی آیتوں اور چند روایات کو پیش کریں گے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا ، وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ، وَبِذِي الْقُرْبٰى ، وَالْيَتَامٰى ، وَالْمَسَاكِينِ ، وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى ، وَالْجَارِ الْجُنُبِ ، وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ ، وَابْنِ السَّبِيلِ ، وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۔ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا ۔(النساء36)

اور اللہ کی بندگی کرو اور اس کا شریک کسی کو نہ ٹھہراؤ، اور ماں باپ سے بھلائی کرو، اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور پاس کے ہمسائے اور دور کے ہمسائے اور کروٹ کے ساتھی اور راہ گیر اور اپنی باندی غلام سے۔ بے شک اللہ کو خوش نہیں آتا کوئی اترانے والا، بڑائی مارنے والا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ جہاں دنیا والے اپنے سے کمتر لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا پسند نہیں کرتے، وہیں کائنات کے مالک و مختار، شفیعِ روزِ شمار حضور پاک ﷺ یتیموں، مسکینوں اور ناداروں کے ساتھ چلنے میں کبھی عار محسوس نہیں فرماتے۔ سنن نسائی کی حدیث ملاحظہ ہو:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِي أَوْفٰى رضي الله عنه قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وآله وسلم يُكْثِرُ الذِّكْرَ ، وَيُقِلُّ اللَّغْوَ ، وَيُطِيلُ الصَّلَاةَ ، وَيُقْصِرُ الْخُطْبَةَ ، وَلَا يَأْنَفُ أَنْ يَمْشِيَ مَعَ الْأَرْمَلَةِ وَالْمِسْكِينِ فَيَقْضِيَ لَهُ الْحَاجَةَ ۔

”حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کثرت سے ذکرِ الٰہی فرماتے، عام بات چیت بہت کم فرماتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کو طویل فرماتے اور خطبے کو مختصر، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیواؤں اور مسکینوں کی حاجت روائی کرنے کے لیے اُن کے ساتھ چلنے میں کوئی عار محسوس نہیں فرماتے تھے۔“

ایک حدیثِ پاک میں ہے: حضور پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے۔" یہ کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دونوں انگلیوں (یعنی شہادت اور اس کے ساتھ والی انگلی) کے ساتھ اشارہ فرمایا۔ (بخاری، ج4، ص102، حدیث:6005)

یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں حضور کا ساتھی بنے، اس سے زیادہ خوش بختی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ حضور سرورِ کائنات ﷺ کی یہ حدیث بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔

فرماتے ہیں: "مسلمانوں کے گھروں میں سب سے بہتر گھر وہ ہے جس میں یتیم ہو اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہو، اور مسلمانوں کے گھروں میں سب سے برا گھر وہ ہے جس میں یتیم ہو اور اس کے ساتھ بد سلوکی کی جاتی ہو۔"

(ابن ماجہ، ج4، ص193، حدیث:3679)

حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”جس نے یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اُس کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا تھا تو اُس کے لیے ہر اس بال کے بدلے نیکیاں ہیں جس جس بال کو اس کا ہاتھ لگا تھا“

یتیموں کی کفالت جنتی ہونے کا مژدۂ جاں فزا ہے۔ نبی پاک ﷺ فرماتے ہیں: ”یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں جائے گا۔“

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”جو شخص کسی مسلمان یتیم بچے کے کھانے پینے کی کفالت کرے اللہ تعالیٰ ضرور اُسے جنت میں داخل کرے گا، سوائے اس کے کہ وہ کوئی ایسا (شرک جیسا) گناہ کرے جس کی بخشش نہ ہو“

ایک اور حدیثِ پاک میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں:

”میں وہ پہلا شخص ہوں جس کے لیے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا، مگر یہ کہ ایک عورت جلدی سے میرے پاس آئے گی۔ میں اُس سے پوچھوں گا: تمہارا کیا مسئلہ ہے؟ تم کون ہو؟ وہ عرض کرے گی: میں وہ عورت ہوں جو اپنے یتیم بچوں کی پرورش کے لیے بیٹھی رہی۔“

لہٰذا ایک معاشرے کو خوبصورت بنانے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے کے ہر فرد کے حقوق ادا کیے جائیں، اور تمام افراد کے حقوق اسی وقت ادا کیے جاسکتے ہیں جب اسلامی تہذیب و تمدن کا قیام عمل میں آئے۔ اگر ہم عالمی منظرنامے پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہتی کہ آج ایک ملک دوسرے ملک سے دست و گریباں ہے۔ اس کے کلیدی وجوہات کا تجزیہ کریں تو معلوم ہو گا کہ ایک دوسرے کے حقوق کی پاسداری دانستہ طور پر کہیں نہ کہیں غصب کرنے کی بے جا کوشش کی جارہی ہے، جس کا نتیجہ جنگ و جدال، شر و فساد کی صورت میں نمایاں ہے۔

لہٰذا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ سے ہمیں یتیموں کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرنا چاہیے، اس کی مکمل رہنمائی حاصل ہو جاتی ہے۔ اللہ کریم ہمیں یتیموں کے حقوق ادا کرنے، ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی توفیقِ رفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین۔

آئینۂ حیات امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ

اسد اللہ الغالب، امام المشارق والمغارب، حلال المشکلات والنوائب، امام الاولیاء، تاجدار ولایت حضرت سیدنا امیر المومنین کا نام نامی اسم گرامی علی، کنیت: ابوالحسن اور ابوتراب ہے۔ آپ کو اپنے لیے "ابوتراب" سننا بہت پسند تھا۔ اس پسندیدگی کا سبب یہ تھا کہ یہ کنیت پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے عنایت فرمائی تھی۔ تاریخ الخلفا میں ہے کہ "ایک روز آپ مسجد شریف کی دیوار کے پاس لیٹے ہوئے تھے، پشت مبارک کو مٹی لگ گئی تھی، حضور اقدس صلی اللہ علی وسلم آپ کے پاس تشریف لائے اور آپ کی پشت مبارک سے مٹی جھاڑ کر (لاڈ کرتے ہوئے) فرمایا ''اِجلِس اَبَا تُراب'' اسی روز سے آپ ابوتراب کہے جانے لگے اور آپ کو یہ نام ہر دل عزیز ہو گیا۔

آپ کا لقب اسد اللہ، فاتح خیبر، حیدر کرار ہے۔ آپ کے والد آقا علیہ الصلوۃ والسلام کے چچا ابو طالب بن عبد المطلب ہیں، اور والدہ مخدومہ فاطمہ بنت اسد بن ہاشم ہیں، اور یہ وہ پہلی ہاشمی خاتون ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا اور ہجرت فرمائی۔

آپ کی ولادت باسعادت عام الفیل کے ۳۰/ سال بعد ۱۳ رجب المرجب کو بروز جمعہ ہوئی۔ اعلان نبوت سے قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اپنی کفالت میں لے کر پرورش فرمائی۔ آپ نو عمروں میں سب سے پہلے ایمان لائے۔ ایمان لانے کے وقت آپ کی عمر کیا تھی اس میں چند اقوال ہیں۔ ایک قول کے مطابق آپ کی عمر شریف پندرہ سال، ایک کے مطابق سولہ سال، ایک کے مطابق آٹھ سال، ایک کے مطابق دس سال تھی۔ بہر حال اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ بلوغت کے قریب آپ ایمان لائے۔ آپ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے چچازاد ہیں۔ نیز ہجرت کے بعد مدینے میں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین وانصار میں عہد مواخات (یعنی ایک مہاجر صحابی اور ایک انصاری صحابی کے درمیاں بھائی چارہ) قائم کر رہے تھے اس موقع پر آپ کو حضور اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے عزت مواخات سے مشرف کیا اور فرمایا: ''انت أخي في الدنيا و الآخرة'' اے علی! تم دنیا اور آخرت دونوں میں میرے بھائی ہو۔

آپ کا عقد نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیاری شہزادی سیدۃ نساء العالمین خاتون جنت حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا سے فرمایا۔

آپ وہ عظیم الشان صحابی ہیں کہ جن کے حق میں سورہ حج کی آیت ۱۹۔ سورہ مجادلہ کی آیت ۱۲۔ سورہ توبہ کی آیت ۱۹۔ سورہ دھر کی آیت ۸،۷،۹۔ سورہ بقر کی آیت ۲۷۴۔ سورہ اعراف کی آیت ۴۳۔ سورہ سجدہ کی آیت ۱۸۔ سورہ مریم کی آیت ۹۶۔

سورہ رعد کی آیت ۷۔ سورہ مائدہ کی آیت ۸۷۔ اور اسی سورہ مائدہ کی آیت ۵۵ وغیرہ آیات نازل ہوئیں۔ آپ عشرۂ مبشرہ سے ہیں جن کے لیے جنت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ غزوۂ تبوک کے علاوہ تمام غزوات میں آپ نے شرکت فرمائی اور ان تمام میں آپ نے شجاعت و جوانمردی کا خوب خوب مظاہرہ فرمایا۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو مدینہ منورہ پر خلیفہ بنایا اور ارشاد فرمایا کہ "تمہیں ہماری بارگاہ میں وہ مرتبہ حاصل ہے جو حضرت موسیٰ کی بارگاہ میں حضرت ہارون کو حاصل تھا"۔

آپ کو فاتح خیبر اور خیبر شکن کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غزوۂ خیبر کے موقع پر سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اسلامی جھنڈا عطا فرما کر فتح خیبر کی بشارت دی تھی۔ حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ: "اس روز آپ نے خیبر کا دروازہ اپنی پیٹھ پر اٹھالیا اور اس پر مسلمانوں نے چڑھ کر قلعہ کو فتح کر لیا تھا، اس کے بعد آپ نے وہ دروازہ پھینک دیا، جب لوگوں نے اسے گھسیٹ کر دوسری جگہ ڈالنا چاہا تو چالیس آدمیوں سے کم اسے اٹھا نہ سکے"۔

حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آپ کو نوازتے ہوئے فرمایا: "میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کے دروازہ ہیں"۔ اسی وجہ سے آپ کو "باب العلم" بھی کہتے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا: "علی مرتضیٰ کو دیکھنا عبادت ہے"۔ (تاریخ الخلفا)

وقت ہجرت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اپنا امین بنا کر مکہ مکرمہ میں چھوڑا اور قریش کی امانتیں دے کر فرمایا کہ: اسے فلاں، فلاں لوگوں کو سپرد کر کے مدینہ ہجرت کر آنا۔ چنانچہ آپ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت فرمانے کے بعد ۳ روز تک مکہ میں ٹھہرے رہے۔ اور معیّن افراد قریش کو ان کی امانت سپرد کر کے تیسرے روز مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ اس دوران آپ کو مطابق حکم رسول بستر نبوت پر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سبز چادر مبارک اوڑھ کر سونے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ مقام صہبا میں آپ ہی کے لیے حضور سے ڈوبے ہوئے سورج کا پلٹ کر عصر کے وقت پر آجانے کا معجزہ ظاہر ہوا۔

آپ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سو چھیاسی (۱۸۶) احادیث کریمہ مروی ہیں اور آپ کے فضائل و مناقب میں بکثرت احادیث کریمہ ہیں۔ محدثین فرماتے ہیں کہ جتنی احادیث حضرت علی کے فضائل میں وارد ہیں کسی اور کی فضیلت میں نہیں آئیں۔

آپ خلیفۂ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بعد امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین ہوئے۔ مدینہ منورہ میں موجود تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ چار سال ۸/ ماہ یا ۹ ماہ اور نو دن مسند خلافت پر رونق افروز رہے۔ ماہ رمضان میں بوقت فجر آپ نماز کے لیے تشریف لے جارہے تھے کہ اچانک بدبخت ابن ملجم نے آپ پر شدید وار کیا، جس سے آپ لہولہان ہوگئے اور ۲۱/ رمضان المبارک شب یک شنبہ ۴۰ھ میں جام شہادت نوش فرما کر داعی اجل کو لبیک کہا۔



حضرت امام علی رضا ابن موسی کاظم رضی اللہ عنہ

شخصیات

از: مولانا محمد توصیف رضا، جھارکھنڈ

حضرت امام علی رضا رضی اللہ عنہ کی ذات ستودہ صفات محتاج تعارف نہیں۔ آپ کا نام مبارک زبان پر آتے ہی آپ کا فہم قرآن اور پیچیدہ مسائل میں عمق نگاہی کا ملکہ ہماری نظروں میں گردش کرنے لگتا ہے۔ آپ اپنی کم سنی کے باوجود علوم وفنون اور فضائل و کمالات میں معاصرین پر فائق وبرتر نظر آتے ہیں۔ آپ دوسری صدی کے مجدد ہیں جیسا کہ اس کی صراحت ابن اثیر نے "جامع الاصول" میں، طاہر محدث پٹنی نے "مجمع بحار الانوار" میں اور مولانا لیس اختر مصباحی نے "امام احمد رضا اور جدید افکار و نظریات" میں بحیثیت "مجدد" شمار کیا ہے۔ اعلی حضرت امام احمد رضا رضی اللہ عنہ نے آپ کے توسل سے یوں دعا کی ہے:

صدق صادق کا تصدق صادق الاسلام کر

بے غضب راضی ہو کاظم اور رضا کے واسطے

ولادت باسعادت: آپ کی پیدائش مدینہ منورہ میں بروز پنج شنبہ ۱۱/ ربیع الآخر ۱۵۳ھ بمطابق ۷۷۰ء بعہد خلیفہ ابو جعفر منصور عباسی ہوئی۔ (شواہد النبوہ، ص ۱۳۹) بعض نے ربیع الآخر کے بجائے ربیع الاول لکھا ہے۔

نام والقاب: آپ کا اسم گرامی علی، کنیت: سامی، ابو الحسن اور القاب صابر، ولی، ضامن اور رضا وغیرہ ہیں جن میں سب سے زیادہ مشہور " رضا" ہے۔ "ابو جعفر محمد بن علی رضا سے کہا گیا: آپ کے والد محترم کا نام مامون نے "رضا" رکھا، اور ان کو ولی عہد بنانے پر راضی تھا، تو آپ نے کہا: اللہ سبحانہ نے ان کا نام "رضا" رکھا۔ کیوں کہ وہ آسمانوں میں اللہ کی رضا تھے اور زمین میں اس کے رسول کی رضا تھے۔ آپ کو گزشتہ آباواجداد میں اس بنا پر خصوصیت حاصل ہے کہ آپ سے موافقین کی طرح مخالفین بھی راضی تھے۔ (شواہد النبوہ، ص ۱۳۹)

بشارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: شواہد النبوۃ میں مذکور ہے: حضرت امام موسی کاظم رضی اللہ عنہ کی والدہ محترمہ فرماتی ہیں: میں نے اپنے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا: تم اپنی کنیز نجمہ (ام ولد) کو اپنے بیٹے موسی کاظم کے حوالے کر دو، جلد اس سے ایک ایسا فرزند ارجمند پیدا ہو گا جو بہترین اہل زمین میں سے ہو گا" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت امام علی رضا رضی اللہ عنہ کی والدہ ماجدہ سے مروی ہے کہ "جب میں ان سے حاملہ ہوئی تو میں نے شکم میں بھاری پن اور کسی تکلیف کا احساس نہیں کیا اور جب میں سوتی تو اپنے پیٹ سے تسبیح و تہلیل کی صدائیں سنتی جس سے میرے دل میں خوف وہراس طاری ہو جاتا اور

جب انہوں نے اس دنیا میں قدم رکھا تو اپنے ہاتھوں کو زمین پر ٹکایا اور نگاہ آسمان کی طرف کی اس حال میں کہ ان کی زبان جنبش کر رہی تھی گویا کہ کسی سے بات کر رہے ہوں اور کسی سے مناجات کر رہے ہوں"۔ (شواہد النبوۃ ص ۲۴۰)

فضائل و کمالات: رب قدیر نے آپ کی ذات میں تمام خوبیاں جمع کر دی تھیں، یہی وجہ تھی کہ مختصر عرصے میں ہی آپ کے علوم و فنون کا شہرہ پوری دنیا میں ہو گیا، حتی کہ اس دور کی عظیم ہستیوں نے بھی آپ کی مقدس بارگاہ میں زانوئے تلمذ تہ کیا۔ جب بھی آپ کی بارگاہ میں کسی نے کوئی پیچیدہ سوال پیش کیا تو تشفی بخش جواب پایا اور اگر کسی سے کبھی مباحثہ ہوا تو آپ نے اپنے سوالات و جوابات سے اس کو محو حیرت کر دیا۔

جب خلیفہ مامون نے اپنی شہزادی کا نکاح امام علی رضا علیہ الرحمہ سے کر دیا اور دولت و سلطنت سونپنا چاہا تو عباسیوں نے اس بات کو ناپسند کیا، خلیفہ مامون نے وضاحت کی کہ میں نے انہیں علم و فضل میں منفرد و بے مثال پایا اس لیے میں نے اس کا ارادہ کیا، لیکن عباسیوں کے ذہنوں میں یہ بات کھٹکتی رہی، انہوں نے امام علی رضا کو ذلیل و رسوا کرنے اور مامون کے دل سے ان کی عزت و محبت نکالنے کا عزم مصمم کر لیا جس کے لیے ان سے مناظرے کی شکل کی ایک مجلس منعقد کی اور ان کے مقابل ایک بے مثل و بے نظیر مناظر "یحیی بن اکثم" کو کھڑا کیا۔ یحیی نے آپ سے متعدد سوالات کیے، آپ نے ان کا اطمینان بخش جواب دیا اور ان کو اس قدر واضح کیا کہ مجلس کے لوگ انگشت بدنداں ہو گئے، اس کے بعد مامون نے امام سے کہا: اب آپ یحییٰ سے سوال کیجیے تا کہ عوام پر آپ کی عزت و احترام راسخ ہو جائے" آپ نے ان سے ارشاد فرمایا" صبح کے وقت ایک مرد نے ایک عورت کی طرف دیکھا، اس وقت وہ اس پر حرام تھی، طلوع آفتاب کے وقت وہ اس پر حلال ہو گئی، ظہر کے وقت پھر اس پر حرام ہو گئی، عصر کے وقت پھر حلال، مغرب کے وقت پھر حرام، عشا کے وقت پھر حلال، آدھی رات کو پھر حرام اور فجر کے وقت پھر حلال "۔ آپ اس مسئلہ کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

یحییٰ بن اکثم یہ سوال سن کی حیران و ششدر رہ گئے اور عرض کیا: عالی جاہ مجھے اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔

حضرت امام علی رضا رضی اللہ عنہ نے مذکورہ مسئلہ کی یوں توضیح و تشریح کی: صبح کے وقت ایک اجنبی نے کنیز کی طرف دیکھا، اس وقت وہ اس پر حرام تھی، طلوع آفتاب کے وقت اس نے اس کو خرید لیا، وہ اس پر حلال ہو گئی، ظہر کے وقت اس نے اس کو آزاد کر دیا تو وہ اس پر حرام ہو گئی، عصر کے وقت اس نے اس سے نکاح کر لیا، وہ حلال ہو گئی، مغرب کے وقت اس نے ظہار کیا، پھر حرام ہو گئی، عشا کے وقت کفارہ دیا حلال ہو گئی، آدھی رات کو طلاق بائن دی پھر حرام ہو گئی اور فجر کے وقت اس نے نکاح کر لیا پھر حلال ہو گئی۔ (تذکرۂ مشائخ قادریہ، برکاتیہ رضویہ ص ۱۶۸، مطبوعہ قادری کتاب گھر، بریلی شریف)

یہ تسلی بھرا جواب سن کر حاضرین حیرت واستعجاب میں پڑ گئے اور مامون بھی ان کی باریک بینی اور عمیق نظری سے بے حد متاثر ہوا اور مملکت و سلطنت کے جملہ امور ان کے حوالے کرنے کا عزم مصمم کر لیا اور ان کو اس بات سے باخبر کیا لیکن آپ نے انکار کیا جیسا کہ موسی بن سلمہ نے بیان کیا ہے۔

جب مسلسل اصرار کرنے سے انکار کی کوئی گنجائش نہ رہی تو چند شرائط کے ساتھ آپ نے منظور کر لیا، الغرض ۵ / رمضان المبارک بروز پنج شنبہ ایک عالی شان کانفرنس منعقد کی گئی جس میں حضرت امام کی تاج پوشی کی گئی، اس کے بعد خلیفۂ وقت نے اپنے بیٹے کو حکم دیا کہ اولاً تم ان سے بیعت کرو، وہ باادب اٹھ کر تعظیم و تکریم بجالایا اور ان سے بیعت کی، مامون نے بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیش بہا زروجواہرات حاضرین پر لٹائے، پھر حضرت امام علی رضا رضی اللہ عنہ نے حمد وصلوۃ کے بعد مجمع کثیر سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا: "اے لوگو! بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہمارا تمہارے اوپر حق ہے اور تمہارا ہمارے اوپر ،تو جب تم یہ (حق) ہمیں ادا کر دو تو تمہارے لیے ہم پر فیصلہ واجب ہے۔ والسلام۔ (تشریف البشر ص ۹۸)

حضرت امام علی رضا علمائے محدثین کی نظر میں: علامہ ابن حجر عسقلانی نے تاریخ نیشاپور سے نقل کیا ہے: "جب آپ نیشاپور تشریف لے گئے تو زائرین کے ہجوم و کثرت کی وجہ سے لوگوں کا چلنا دشوار ہو گیا، آپ ایک خچر پر سوار تھے اور لوگ آپ کے سر پر چھاتا لگائے ہوئے تھے، جس کی وجہ سے عوام آپ کے چہرۂ انور کی زیارت نہیں کر پا رہے تھے، اس وقت ابوزرعہ رازی (م: ۲۶۴ھ) اور محمد بن اسلم طوسی (م: ۲۴۲ھ) نے جو اس زمانے کے مشہور حافظان حدیث تھے، آگے بڑھ کر خچر کی لگام تھام لی۔ ان کے ساتھ طلبہ و محدثین اس کثرت سے تھے کہ شمار میں نہیں آسکتے، ان دونوں نے نہایت عجز و انکساری سے عرض کیا کہ حضور! اپنے جمال باکمال سے لوگوں کو مشرف فرمائیں اور اپنے آبائے کرام کی کوئی حدیث سنائیں تو آپ نے خچر روک دیا اور نقاب ہٹا دیا، خلقت کی آنکھیں آپ کی طلعت ہمایوں کو دیکھ کر ٹھنڈی ہوئیں، وہ آپ کے فیض کرم سے بہرہ ور ہونے کے لیے اس قدر بے خود ہوئے کہ اگر آپ سے نہ مل پاتے تو آپ کے خچر کے پاؤں چومتے اور اسی کو اپنے لیے باعث رحمت سمجھتے"۔

اس کے بعد آپ نے حدیث روایت کی:

حَدثنِي أَبي مُوسَى الكاظم عَن أَبِيه جَعْفَر الصَّادِق عَن أَبِيه مُحَمَّد الباقر عَن أَبِيه زين العابدين عَن أَبِيه الْحُسَيْن عَن أَبِيه عَليّ بن أبي طَالب رَضِي الله عَنْهُم قَالَ حَدثنِي حَبِيبِي وقرة عَيْني رَسُول الله صلى الله عَلَيْهِ وَسلم قَالَ (حَدثنِي جِبْرِيل قَالَ سَمِعت رب الْعِزَّة يَقُول لَا إِلَه إِلَّا الله حصني فَمن قَالَهَا دخل حصني وَمن دخل حصني أَمن من عَذَابي)

پھر آپ نے اپنے رخ انور سے حائل پردے کو ہٹایا تو لوگوں نے اپنی تشنہ آنکھیں سیر اب کیں اور تقریباً بیس ہزار محدثین نے اس حدیث کو نقل کیا۔ (الصواعق المحرقۃ۔ ص ۲۰۴)

برکات اسناد امام علی رضا: حضرت امام احمد بن حنبل علیہ الرحمہ نے فرمایا: **لو قری ھذا الاسناد علی مجنون لافاق من جنونہ** " اگر یہ اسناد مجنون پر پڑھی جائے تو ضرور وہ شفایاب ہو گا۔ (ایضا)

ابو القاسم قشیری نے فرمایا: "یہ حدیث اسی سند سے بعض امرائے ساسانیہ کو پہنچی تو اس کو انہوں نے آب زر سے لکھوایا اور اس قدر انہیں فیض پہنچا کہ اپنے وارثین کو وصیت کی کہ جب میری وفات ہو جائے تو اس کو میری قبر میں رکھ دینا، شاید خدا اسی کی

برکت سے مجھے بخش دے۔ دنیا میں ان کی برکت پہنچی ہی حتی کہ مامون کی موت کے بعد کسی نے ان کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اللہ عزوجل نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اس نے جواب دیا کہ " **غفر لی بتلفظی بلا الہ الا اللہ و تصدیق ان محمدا رسول اللہ** " اللہ تعالی نے مجھے میرے لا الہ الا اللہ بولنے اور میرے اس بات کی تصدیق کہ (محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں) کی وجہ سے مجھے بخش دیا۔ (تذکرۂ مشائخ قادریہ، ص۱۶۹)

فہم قرآن: آپ کے مطالعہ کی وسعت اور فکر و نظر کی گہرائی بالخصوص آپ کی قرآن میں باریک بینی کے وقت کے مایہ ناز علمائے کرام معترف تھے، ایک مرتبہ آپ عمدہ اور قیمتی جامہ زیب تن کیے ہوئے تھے، جب مامون نے دیکھا تو بے اختیار بول پڑا: اے ابن رسول! کیا یہ کپڑا آپ کے لیے زیب دیتا ہے؟ آپ نے بلا جھجک ارشاد فرمایا: ایسے تو ہمارے سلف صالحین کے بھی لباس ہوتے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام سونے کے تاروں سے بنے ہوئے قبا پہنتے تھے اور زر و جواہرات سے مرصع تخت پر بیٹھ کر حکومت کرتے تھے۔ نیز یہ قرآن میں موجود ہے: "تم فرماؤ کس نے حرام کی اللہ کی وہ زینت جو اس نے اپنے بندوں کے لیے نکالی اور پاک رزق" (اعراف، آیت:۳۲)

ایک مرتبہ خلیفہ مامون کی طبیعت علیل ہوگئی، اس نے نذر مانی کہ اگر اس بیماری سے شفا پا لیا تو زر کثیر خیرات کروں گا، جب مالک حقیقی نے شفا بخشی تو اس نے متعدد علمائے کرام سے پوچھا کہ زر کثیر کا اطلاق کتنے پر ہوتا ہے؟ سب نے اپنے اعتبار سے جواب دیا مگر اس کو تشفی نہ ہوئی بالآخر اس نے یہ عریضہ امام کی بارگاہ میں پیش کیا، آپ رضی اللہ عنہ نے ایسا معقول جواب دیا کہ سب متحیر ہوگئے، آپ نے ارشاد فرمایا: رب قدیر نے فرمایا ہے: "بے شک اللہ نے بہت جگہ تمہاری مدد کی" (التوبہ، آیت:۲۵) اور غزوات و سرایا تراسی تھے، مامون نے انہیں کے قول پر عمل کرتے ہوئے تراسی دینار صدقہ کیا اور اس جواب کی عمق نگاہی سے بہت متاثر ہوا۔ (تذکرۂ مشائخ قادریہ برکاتیہ ص ۷۰)

دعوت اسلام: آپ نے دین متین کی بڑی خدمت انجام دی، اشاعت اسلام کی فکر آپ کو ہمہ وقت بے چین کیے رہتی تھی، آپ کی زندگی کے ہر شعبے میں خدمت دین کی جھلک نمایاں ہے، آپ ہی کی سعی و کوشش کا ثمرہ ہے کہ حضرت معروف کرخی علیہ الرحمہ جیسے فرد نے آپ کے دست حق پرست پر ایمان لا کر علوم و فنون اور رشد و ہدایت کا وہ چشمہ جاری کیا جس سے آج تک ایک عالم سیراب ہو رہا ہے۔

قلمی جواہر پارے: صرف ایک کتاب کا تذکرہ ملتا ہے جو آپ نے مامون کی فرمائش پر علم طب میں تحریر فرمائی تھی۔

وفات: آپ نے اپنے خادم ہرنمہ بن امین سے پیشین گوئی کی تھی کہ اے ہرنمہ! میری موت قریب ہے اور جلد میرے آباو اجداد سے میری ملاقات ہوگی، میری موت اس طور پر ہوگی کہ میں مامون کے پاس انگور اور انار کھاؤں گا؛ جس کی وجہ سے میری موت واقع ہوگی، بالکل اسی کے مطابق ۲۱ / رمضان المبارک ۲۰۳ھ بروز جمعہ ۵۵ سال کی عمر میں شہادت ہوئی۔ البتہ شواہد النبوہ کے مصنف نے ۲۰۸ھ لکھا ہے۔

قبر انور: طوس کا ایک قریہ "سناباد" میں آپ کا مزار مرجع عوام و خواص ہے۔



قصیدہ بردہ کے مشہور زمانہ شعر کی عارفانہ تشریح

از: مولانا ازہر القادری، جامعہ اہل سنت امداد العلوم، سدھارتھ نگر

متفرقات

مَوْلَايَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا
عَلَى حَبِيبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

ترجمہ: اے میرے مولا! اپنے محبوب پر ہمیشہ، ہر دم، درود و سلام نازل فرما، جو ساری مخلوق میں سب سے بہتر اور برگزیدہ ہیں۔

یہ شعر نہیں، دعا کی وہ سانس ہے جو وقت کے پھیپھڑوں میں اتر کر کبھی خارج نہیں ہوتی۔ قصیدۂ بردہ کے اس آخری شعر میں امام شرف الدین بوصیری نے لفظ نہیں چنے، تقدیر کے چراغ جلائے ہیں۔ یہ وہ ندا ہے جو بندے کی ٹوٹی ہوئی آواز سے نکل کر ربانی شان میں ڈھل جاتی ہے، اور وہ التجا ہے جو سوال نہیں رہتی، قبولیت کا قرینہ بن جاتی ہے۔ یہاں ابتدا ہی میں قاری ایک ایسے سمندر کے دہانے پر کھڑا ہے جس کی ہر موج معنی ہے، ہر جھاگ معرفت اور ہر گہرائی عشق مصطفیٰ کی تہہ در تہہ وسعت۔

یہاں سے تحریر شروع نہیں ہوتی، یہاں تحریر نکلتی ہے۔ جیسے دل کے کسی نہاں خانے سے آنسو خود راستہ بنا کر پلکوں تک آ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس شعر کی تمہید میں بھی ٹھہراؤ ہے، وقار ہے، اور ایک ایسا روحانی جلال ہے جو قاری کو جھنجھوڑتا نہیں بلکہ آہستہ آہستہ اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔ یہ نعت نہیں، نعت کی علت ہے؛ یہ دعا نہیں، دعا کی دلیل ہے؛ یہ کلام نہیں، کلام کی روح ہے۔

"**مَوْلَايَ**" یہ لفظ نہیں، بندگی کی پوری تاریخ ہے۔ اس ایک ندا میں عبدیت کی تمام جہتیں سمٹ آئی ہیں۔ یہاں "مولیٰ" محض مالک نہیں، مربی ہے، رازق ہے، راہ دکھانے والا ہے، تھام لینے والا ہے۔ "یا" کی ندا میں صنعت ندا کی جلوہ گری ہے، مگر یہ ندا باہر کی نہیں، اندر کی ہے: زبان سے کم، دل سے زیادہ ادا ہونے والی پکار۔ یہ وہ لمحہ ہے جہاں منطق خاموش ہو جاتی ہے اور وجدان

بولنے لگتا ہے۔ فلسفہ یہاں سر جھکا لیتا ہے اور عرفان آگے بڑھتا ہے۔ بندہ اپنے تمام علمی غرور، فکری ادعا اور ذہنی حجتوں کو ایک طرف رکھ کر صرف اتنا کہتا ہے: **"مَوْلَايَ"**۔ یہی ایجاز ہے، یہی اختصار میں کائنات سمیٹ لینے کا ہنر۔

اس ایک لفظ میں صنعت کنایہ بھی ہے اور صنعت استعارہ بھی۔ مولیٰ کہنا دراصل یہ اقرار ہے کہ میں محتاج ہوں، میں وابستہ ہوں، میں بے سہارا ہوں اگر تو نہ ہو۔ یہاں صنعت تضاد بھی پنہاں ہے: بندے کی کمزوری اور رب کی قدرت، فقیر کی فریاد اور مالک کی عطا۔ یہی تضاد حسن تعلیل بن کر دعا کو وزن عطا کرتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں کلام میں عقیدہ اور ذوق محبت باہم بغل گیر ہو جاتے ہیں۔

لسانی سطح پر **"مَوْلَايَ"** کی صوتیات میں نرمی ہے، حلاوت ہے، ایک مدھم سی موسیقیت ہے جو بحر بردہ کے ساتھ مل کر دل میں ارتعاش پیدا کرتی ہے۔ "مو" کی گولائی، "لا" کی کشادگی اور "ی" کی لطیف سی کھنک ـــ یہ سب مل کر صوتی حسن کی وہ فضا قائم کرتے ہیں جس میں لفظ خود معنی بن جاتا ہے۔ یہ صنعت مراعات صوتی کی اعلیٰ مثال ہے، جہاں آواز اور احساس ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے ہیں۔

عرفانی سطح پر **"مَوْلَايَ"** فنا کا اعلان ہے۔ یہاں انا تحلیل ہو رہی ہے، "میں" پگھل کر "تو" میں ڈھل رہی ہے۔ یہی صوفیانہ نکتہ ہے: عبد جب مولیٰ کہتا ہے تو دراصل خود کو مٹا کر نسبت ربوبیت میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ مقام تسلیم ہے، مقام رضا ہے، مقام سپردگی ہے۔ یہاں نہ سوال کی تلخی ہے، نہ مطالبے کی سختی۔ بس ایک نرم سی التجا ہے جو یقین کے پروں پر سوار ہے۔

اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر آگے پورا شعر کھڑا ہے۔ اگر **"مَوْلَايَ"** نہ ہو تو "صل وسلم" محض الفاظ رہ جائیں، اور اگر یہ ندا دل سے نہ نکلے تو دائمی درود کی آرزو محض ایک خواہش بن کر رہ جائے۔ اس ایک لفظ میں حسن مطلع بھی ہے اور پورے قصیدے کی روح بھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شعر شروع نہیں ہوتا، یہ کھلتا ہے، اور اس کے کھلتے ہی معنی کی خوشبو چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔

یہ تھی تمہید اور **"مَوْلَايَ"** کی دنیا۔ اب ہم اسی طرح **" صَلِّ وَ سَلِّمْ "** کی طرف بڑھیں گے، جہاں دعا حرکت میں آتی ہے اور محبت زبان پکڑ لیتی ہے۔

" صَلِّ وَ سَلِّمْ " یہاں دعا حرکت پکڑتی ہے، اور محبت زبان۔ **"مَوْلَايَ"** کی خاموش گہرائی سے اب کلام اٹھتا ہے، مگر شور نہیں کرتا؛ یہ وہ ارتعاش ہے جو سمندر کے نیچے چلتا ہے اور ساحلوں کو بدل دیتا ہے۔ **"صل"** میں التماس کی نرمی ہے، اور **"سلم"** میں اطمینان یقین کی ٹھہری ہوئی روشنی۔ یہ دو لفظ نہیں، دو جہان ہیں۔ ایک میں فیضان ربوبیت کا نزول، دوسرے میں امن رسالت کی دائمی چھاؤں۔ یہاں دعا صرف مانگ نہیں رہتی، نظام کائنات سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

"**صل**" یہ فعل امر ہے، مگر ادب میں لپٹا ہوا۔ یہاں امر کا لہجہ حکم نہیں بنتا، بلکہ عرض کی خوشبو لے لیتا ہے۔ بدیع کے باب میں یہ حسن طلب کی روشن مثال ہے، جہاں خواہش اپنی شدت کے باوجود نزاکت نہیں کھوتی۔ معانی کے افق پر یہ لفظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ درود بندے کی ایجاد نہیں، رب کی سنت ہے؛ بندہ تو بس اس ازلی بہاؤ میں شامل ہو کر اپنی نسبت درست کرتا ہے۔ تلمیح یہاں خود قرآن کی طرف کھلتی ہے، جہاں درود کا حکم بھی ہے اور اس کی علت جمیل بھی۔ یوں دعا دلیل کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے، اور عقیدہ محبت کے ساتھ۔

لسانی کیفیات میں "**صل**" کی صوتی سختی نہیں، بلکہ "ص" کی صلابت کے ساتھ "ل" کی لطافت اور "ی" کی باریک کھنک ہے۔ یہ صنعت مراعات صوتی ہے، جہاں آواز معنی کی ہدایت کرتی ہے۔ فلسفیانہ سطح پر یہ لفظ علت و معلول کی گرہ کھولتا ہے: درود سبب بنتا ہے، فیضان اس کا نتیجہ؛ مگر حسن تعلیل یہ ہے کہ نتیجہ بھی سبب میں شامل ہو جاتا ہے۔ یوں ایک دائروی کمال قائم ہوتا ہے جس میں ابتدا اور انتہا ایک دوسرے میں گم ہو جاتے ہیں۔

"**و**" یہ محض عطف نہیں، وحدت کا پل ہے۔ یہاں وصل اور فصل دونوں کی صنعتیں بیک وقت جلوہ گر ہیں۔ "**صل**" اور "**سلم**" الگ بھی ہیں اور ایک بھی۔ یہ وہ "و" ہے جو صنعت مراعات النظیر کو پورا کرتی ہے، کیوں کہ فیضان اور سلام ایک ہی نسبت کے دو رخ ہیں۔ عرفانی منطق میں یہ "و" جمع کی علامت ہے: نور بھی، سکون بھی؛ جلال بھی، جمال بھی۔

"**سلم**" یہ لفظ دعا کو ٹھہراؤ عطا کرتا ہے۔ اگر "صل" حرکت ہے تو "**سلم**" سکون؛ اگر ایک میں نزول رحمت ہے، تو دوسرے میں قیام امن۔ یہاں سلام محض سلامتی نہیں، تسلیم بھی ہے۔ تسلیم مقام، تسلیم کمال، تسلیم اختیار۔ صوفیانہ دلالت میں یہ لفظ فنائے اضطراب ہے؛ جہاں دل ہر وسوسے سے نکل کر حضور کے امن میں داخل ہو جاتا ہے۔ صنعت کنایہ میں یہ وہ اشارہ ہے کہ جس پر سلام ہو، اس کی ذات ہر آفت سے بلند اور ہر نقص سے پاک ہے۔

بلاغت کے آئینے میں "**صَلِّ وَسَلِّمْ**" ایک ایسا مرکب ہے جس میں ایجاز بھی ہے اور اطناب کی وسعت بھی۔ ایجاز لفظ میں، اطناب معنی میں۔ یہاں صنعت تضاد کی نرم سی جھلک بھی ہے: حرکت و سکون، طلب و تسلیم، شوق و قرار۔ مگر یہ تضاد ٹکراؤ نہیں، توازن پیدا کرتا ہے؛ یہی توازن اس شعر کی موسیقیت کا راز ہے، بحر کے ساتھ ہم قدم، دل کے ساتھ ہم آہنگ۔

کلامی اعتبار سے یہ دو لفظ ایمان کے مرکز کو مضبوط کرتے ہیں۔ درود رسالت کی تعظیم ہے، اور سلام رسالت کی حفاظت؛ ایک میں محبت کا اظہار، دوسرے میں عقیدت کی پاسبانی۔ یہیں سے عقل کو بھی قرار ملتا ہے، کیوں کہ جس نسبت پر رب کی رحمت اور امن اترے، اس پر اعتراض کی گرد نہیں بیٹھتی۔ یہی منطقی اطمینان ہے جو فلسفے کو خاموش نہیں کرتا بلکہ مطمئن کر دیتا ہے۔

یوں " صَلِّ وَ سَلِّمْ " دعا کی سانس کو باقاعدہ کر دیتے ہیں۔ نہ تیز، نہ رکی ہوئی؛ بس مسلسل، ہم آہنگ، دائمی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں لفظ عبادت بن جاتا ہے اور عبادت فن۔ یہاں حسن ادا، حسن ترتیب اور حسن ترکیب ایک ساتھ مسکرا اٹھتے ہیں، اور معنی اپنی تازگی کے ساتھ قاری کے دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔

یہاں تک وہ مقام تھا جہاں دعا نے چلنا سیکھا اور محبت نے بولنا۔ اب ہم " دَائِمًا اَبَدًا " کی اس وسعت میں اتر رہے ہیں جہاں وقت ہار مان لیتا ہے اور دوام معنی بن جاتا ہے۔

" دَائِمًا اَبَدًا " یہاں دعا وقت سے آزاد ہو جاتی ہے۔ " صَلِّ وَ سَلِّمْ " کی حرکت و سکون کے بعد یہ دو لفظ کلام کو ایسے افق پر لے جاتے ہیں جہاں گھڑیاں اپنی سوئیاں سمیٹ لیتی ہیں اور لمحے اپنی سرحدیں کھو دیتے ہیں۔ یہ دوام کی وہ صدا ہے جو زمانے کے کان میں نہیں، ابدیت کے دل میں پڑتی ہے۔ یہاں دعا ایک واقعہ نہیں رہتی، ایک حالت بن جاتی ہے۔ ایسی حالت جو شروع بھی ہے اور ختم بھی نہیں، جو آغاز کے بغیر جاری اور انجام کے بغیر قائم۔

" دَائِمًا " یہ لفظ تسلسل کا چراغ ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جس میں عبادت وقفوں کی محتاج نہیں رہتی۔ صنعت ایجاز کے ساتھ یہاں معنی کی وسعت پھیلتی چلی جاتی ہے: ایک لفظ، مگر اس میں صدیوں کی روانی؛ ایک آواز، مگر اس میں نسلوں کی سانسیں۔ لسانی اعتبار سے دا" کی کشادگی اور "ئما" کی ٹھہری ہوئی گونج، صوتی حسن کو ایک مستقل آہنگ عطا کرتی ہے۔ یہ صنعت مراعات وزنی اور صنعت توازن کی لطیف مثال ہے، جہاں لفظ خود اپنے دوام کی خبر دیتا ہے۔

عرفانی سطح پر " دَائِمًا " وقت کے قید خانے سے رہائی ہے۔ یہاں صوفیانہ وجدان کہتا ہے کہ جو نسبت حق سے جڑ جائے، وہ حادث نہیں رہتی۔ درود جب "دائماً" ہو جائے تو بندہ بھی لحاتی نہیں رہتا؛ اس کی دعا اس کے ہونے سے بڑی ہو جاتی ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں فنا بقا میں بدلتی ہے۔ فنا عن النفس، بقا بالرسول۔ یہ حسن تعلیل کی وہ جہت ہے جس میں دوام کی علت خود محبوب کی نسبت بن جاتی ہے۔

" اَبَدًا " اگر " دَائِمًا " تسلسل ہے تو " اَبَدًا " وسعت۔ یہاں زمان کا دائرہ ٹوٹتا ہے اور ابدیت کا افق کھلتا ہے۔ فلسفیانہ منطق میں یہ لفظ علت و غایت دونوں کو سمیٹ لیتا ہے: ابتدا بھی اسی میں، انتہا بھی اسی میں۔ صنعت تضاد کی ایک نہایت حسین صورت یہاں جلوہ گر ہے۔ فنا کے مقابل ابد، محدود کے مقابل لامحدود۔ مگر یہ تضاد تصادم نہیں، تکمیل ہے۔ ابد، دوام کی آخری منزل نہیں، اس کا اصل وطن ہے۔

بلاغت کے آئینے میں " دَائِمًا "، اَبَدًا " تکرار نہیں، تاکید ہے۔ یہ صنعت تکرار کی وہ مثال ہے جہاں تکرار معنی کو بھاری نہیں کرتی، بلکہ اسے وزن عطا کرتی ہے۔ یہاں صنعت لف و نشر کی ایک مخفی ترتیب بھی ہے: " صَلِّ " کے ساتھ " دَائِمًا "، اور "

سَلِّمْ " کے ساتھ " **أَبَدًا** "۔ یوں فیضان کا تسلسل اور امن کی ابدیت ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ یہ حسن ترتیب ہے، وہ بھی بغیر اعلان کے، محض احساس کی سطح پر۔

کلامی و ایمانی تناظر میں یہ دو لفظ عقیدے کو استحکام دیتے ہیں۔ درود کسی موسم کا محتاج نہیں، کسی حال کا مرہون نہیں؛ یہ خوشی میں بھی ہے، غم میں بھی؛ ہجوم میں بھی، تنہائی میں بھی۔ **"دائماً ابداً"** کہہ کر بندہ گویا یہ اعلان کرتا ہے کہ میری نسبت وقتی نہیں، میری محبت مشروط نہیں، میرا ایمان لمحاتی نہیں۔ یہی وقار بیان ہے، یہی متانت فکر۔

جمالیاتی سطح پر ان دونوں لفظوں میں ایک خاموش سی موسیقیت ہے۔ ایسی موسیقیت جو شور نہیں کرتی، مگر دل کے اندر گونجتی رہتی ہے۔ یہ صنعت آہنگ اور صنعت ترنم کی نرم سی جھلک ہے، جہاں بحر بردہ کی روانی معنی کی روانی سے ہم قدم ہو جاتی ہے۔ یہاں تخیل کو بھی سکون ملتا ہے، اور تصور کو بھی قرار؛ احساس اپنی جگہ ٹھہر جاتا ہے، مگر بہاؤ ختم نہیں ہوتا۔

یوں " **دَائِمًا أَبَدًا** " دعا کو تاریخ سے نکال کر تقدیر میں لکھ دیتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں لفظ عبادت سے آگے بڑھ کر عہد بن جاتا ہے۔ ایسا عہد جو ٹوٹتا نہیں، تھکتا نہیں، بدلتا نہیں۔ یہاں معنی تازہ بھی ہے اور قدیم بھی؛ یہی اس شعر کی رمزیت ہے، یہی اس کی گیرائی۔

یہ رہا وہ مقام جہاں وقت پیچھے رہ گیا اور دوام آگے نکل گیا۔ اب ہم " **عَلَىٰ حَبِيبِكَ** " کی طرف بڑھیں گے، جہاں نسبت اپنا چہرہ دکھاتی ہے اور محبت اپنا مرکز پاتی ہے۔

" **عَلَىٰ حَبِيبِكَ** " یہاں دعا کو قبلہ ملتا ہے۔ اگر پہلے ندا تھی، پھر حرکت، پھر دوام؛ تو اب نسبت ہے۔ وہ نسبت جس کے بغیر ہر دعا معلق رہتی ہے۔ **"علیٰ"** سمت کا حرف ہے، مگر یہاں سمت جغرافیہ نہیں، تقدیس ہے۔ یہ وہ بلاغی موڑ ہے جہاں کلام اپنے مرکز پر آکر ٹھہر جاتا ہے۔ صنعت مراعاۃ النظیر پوری شان سے جلوہ گر ہے: دعا کا فیضان اسی پر نازل ہو جس کے سبب دعا دعا بنی۔ یوں **"علیٰ"** محض حرف جر نہیں رہتا، حرف جلال بن جاتا ہے۔

لسانی سطح پر **"علیٰ"** کی بلندی خود اپنے معنی کی گواہی دیتی ہے۔ یہ صنعت صوتی میں پیکر تراشی ہے: زبان جب **"ع"** کے گہرے حلق سے اٹھتی ہے اور **"لیٰ"** کی کشادگی میں کھلتی ہے تو گویا معنی اپنی قامت سیدھی کرتا ہے۔ یہاں استعارہ بھی ہے اور کنایہ بھی۔ بلندی کا ذکر دراصل مرتبے کی رفعت ہے، اور نزول رحمت کی سمت کی تعیین۔ فلسفیانہ منطق میں یہ علت غائی کی طرف اشارہ ہے: رحمت کا نزول بے سمت نہیں، محبوب کی طرف ہے۔

" **حَبِيبِكَ** " یہاں نسبت اپنا جمال دکھاتی ہے۔ **"رسولک"** نہیں، **"نبیک"** نہیں، بلکہ " **حَبِيبِكَ** " یعنی وہ جسے تو نے خود محبت کے منصب پر فائز کیا۔ یہ لفظ صنعت انتخاب کی اعلیٰ مثال ہے، جہاں لفظ اپنے معنی سے آگے بڑھ کر ذوق الٰہی کی خبر دیتا ہے۔

حبیب ہونا محض قرب نہیں، محبوبیت کا اعلان ہے؛ یہ وہ مقام ہے جہاں جلال، جمال میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ کلامی اعتبار سے یہ نسبت رسالت کی اصل روح کو روشن کرتی ہے: رسالت منصب ہے، اور محبوبیت اس منصب کا دل۔

عرفانی سطح پر "حبیبک" محبت کی سند ہے۔ صوفیانہ وجدان کہتا ہے کہ جسے حق نے محبوب کہا، اس پر محبت کرنا ایمان کی فطرت ہے۔ یہاں صنعت تلمیح بھی خاموشی سے کام کرتی ہے۔ اس ازلی میثاق کی طرف اشارہ، جب روحوں نے پہچان لیا تھا کہ محبت کی شاہراہ اسی نام پر آکر مکمل ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ درود کی ہر لہر اسی ساحل سے ٹکرا کر واپس معنی بن جاتی ہے۔

بلاغت میں " **عَلَىٰ حَبِيبِكَ** " ایک مکمل ترکیب ہے، مگر اس کی معنوی وسعت بے کنار۔ یہاں صنعت لف و نشر مرتب کا حسن بھی ہے: "**صل**" اور "**سلم**" دونوں کا مرجع ایک ہی ہے۔ حبیب رب۔ یہ حسن ربط ہے، وہ بھی اس درجے کا کہ قاری کو جوڑ دکھائی نہیں دیتا، صرف وحدت محسوس ہوتی ہے۔ یہی وحدت تاثر ہے، یہی وحدت موضوع۔

جمالیاتی سطح پر اس ترکیب میں ایک لطیف سی نرمی ہے۔ نہ خطابت کا شور، نہ مناجات کی گریہ زاری؛ بس ایک شفاف سا اعتراف کہ محبت کا حق محبت ہی جانتی ہے۔ صنعت حلاوت بیان یہاں پوری آب و تاب سے موجود ہے، جہاں لفظ کانوں سے زیادہ دل میں اترتا ہے۔ "ک" کی اضافت محبوبیت کو ذاتی بنا دیتی ہے۔ یہ صنعت تخصیص ہے، جہاں نسبت عام نہیں رہتی، خاص ہو جاتی ہے۔

فکری اعتبار سے " **عَلَىٰ حَبِيبِكَ** " درود کے فلسفے کو مکمل کرتا ہے۔ درود کسی شخصیت پر نہیں، اس محبوب پر ہے جو کائنات کے لیے میزان ہدایت ہے۔ یہاں منطق بھی مطمئن ہے، کیوں کہ مرکز کے بغیر نظام نہیں چلتا؛ اور وجدان بھی سیراب ہے، کیوں کہ محبت کے بغیر ایمان سوکھ جاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں عقل اور عشق ایک دوسرے کے مخالف نہیں، معاون بن جاتے ہیں۔

یوں " **عَلَىٰ حَبِيبِكَ** " دعا کو رخ عطا کرتا ہے، معنی کو ٹھکانہ دیتا ہے، اور محبت کو نام۔ یہاں کلام اپنی شناخت پالیتا ہے اور قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ اب بات اپنی اصل کی طرف لوٹ آئی ہے۔ جیسے دریا سمندر میں پہنچ کر خاموش ہو جائے۔

یہ تھی وہ ساعت سعید جہاں دعا نے اپنا مرکز پہچانا اور نسبت نے اپنا جمال دکھایا۔

اب ہم " **خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ** " کی اس وسعت میں داخل ہوں گے جہاں محبوبیت کائنات کی میزان بن جاتی ہے اور فضیلت اپنی آخری حد کو چھوتی ہے۔

" **خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ** " یہاں کلام اپنے عروج پر نہیں پہنچتا، بلکہ اپنے انجام کمال کو پالیتا ہے۔ یہ اختتام نہیں، تکمیل ہے؛ یہ بندش نہیں، وسعت ہے۔ اگر پہلے ندا تھی، دعا تھی، دوام تھا اور نسبت تھی، تو اب میزان ہے۔ وہ میزان جس پر پوری کائنات

کو پر کھا جاتا ہے۔ یہاں لفظ "**خَيْرِ**" صرف تقابل نہیں، انتخاب الٰہی ہے؛ اور "**الْخَلْقِ**" محض مخلوق نہیں، تاریخ وجود ہے؛ جب کہ "**كُلِّهِمِ**" اس انتخاب کو آفاقیت عطا کر دیتا ہے۔

"**خَيْرِ**" یہ لفظ اپنے اندر صنعت تفضیل کا پورا جہان سمیٹے ہوئے ہے، مگر اس تفضیل میں کسی کی تحقیر نہیں، بلکہ سب کی تکریم ہے۔ یہی حسن تعلیل کا کمال ہے کہ فضیلت یہاں سبب رحمت بنتی ہے، سبب تفاخر نہیں۔ فلسفیانہ سطح پر "**خَيْرِ**" علت غائی ہے: وجود کی غایت خیر ہے، اور خیر کا مظہر اتم وہی ہے جس پر درود اتر رہا ہے۔ منطق یہاں سوال نہیں اٹھاتی، سر جھکاتی ہے؛ کیوں کہ جب خیر مطلق سامنے ہو تو دلیل خود خاموش ہو جاتی ہے۔

لسانی کیفیات میں "**خَيْرِ**" کی "**خ**" کی گہرائی، "**ی**" کی لطافت اور "**ر**" کی ٹھہری ہوئی لرزش۔ یہ سب مل کر صوتی حسن کی ایسی فضا قائم کرتے ہیں جو لفظ کو معنی سے پہلے محسوس کروا دیتی ہے۔ یہ صنعت مراعات صوتی اور صنعت حلاوت کا سنگم ہے، جہاں لفظ بولنے سے پہلے دل میں اترتا ہے۔ یہاں مبالغہ نہیں، مبالغۂ حسن ہے۔ کیوں کہ بیان حقیقت سے آگے نہیں بڑھتا، حقیقت بیان سے بڑی رہتی ہے۔

"**الْخَلْقِ**" یہ لفظ کائنات کی پوری وسعت اپنے دامن میں لے لیتا ہے۔ آسمان، زمین، فرشتے، انسان، جن، زمان، مکان۔ سب اس ایک لفظ کے اندر سانس لیتے ہیں۔ یہ صنعت عموم ہے، مگر اس عموم میں ترتیب بھی ہے، توازن بھی۔ بدیع کے باب میں یہاں صنعت مراعات النظیر جلوہ گر ہے: مختلف اجناس، مگر ایک نسبت؛ مختلف مراتب، مگر ایک مرکز۔ عرفانی سطح پر "**الْخَلْقِ**" کثرت کا نام ہے، اور اسی کثرت میں خیر مطلق کا ظہور وحدت کی دلیل بن جاتا ہے۔

" کلہم "۔ یہ لفظ فیصلے کی مہر ہے۔ یہاں استثنا کی کوئی گنجائش نہیں، تخصیص کی کوئی دراڑ نہیں۔ یہ صنعت تاکید ہے، وہ بھی اس درجے کی کہ معنی کو حتمی بنا دیتی ہے۔ فلسفہ اسے جامع کہتا ہے، منطق اسے کلیہ، اور عرفان اسے تجلی کامل۔ یہاں لفظ ختم ہو جاتا ہے مگر مفہوم ختم نہیں ہوتا۔ "کلہم" کے ساتھ فضیلت زمانے، مکانی حدود اور تاریخی مراحل سے ماورا ہو جاتی ہے۔ یہی آفاقیت ہے، یہی عالمگیریت رسالت۔

بلاغت کے آئینے میں یہ پورا مصرع حسن مطلع کی کامل مثال ہے۔ ابتدا دعا سے ہوئی تھی، اور اختتام کائناتی اعلان پر۔ یہ صنعت حسن ترتیب ہے، جہاں ہر جز اپنے مقام پر آکر ٹھہرتا ہے۔ یہاں صنعت لف و نشر غیر مرتب بھی جھلک دکھاتی ہے: پہلے دعا، پھر محبوب، اور آخر میں محبوب کی وسعت — گویا معنی دائرے کی صورت مکمل ہو گیا۔

عقائد و کلام کے تناظر میں "**خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ**" ایمان کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ یہاں رسالت کی افضلیت بھی ہے، شفاعت کی بنیاد بھی اور اتباع کی منطق بھی۔ اگر وہ خیر مطلق ہیں تو اتباع خیر ہے، محبت خیر ہے، درود خیر ہے۔ اور یہی منطق تسلسل ایمان کو داخلی استحکام عطا کرتا ہے۔ عقل مطمئن، دل مسرور، اور روح سجدہ ریز ہو جاتی ہے۔

جمالیاتی سطح پر اس اختتام میں ایک وقار ہے۔ نہ شور، نہ دعویٰ؛ بس ایک شفاف اعلان جو خود اپنی دلیل ہے۔ صنعت سکوت یہاں بولتی ہے: لفظ کم، معنی بے حد۔ یہ وہ مقام ہے جہاں قاری پر وجد طاری نہیں ہوتا، بلکہ وقار طاری ہوتا ہے۔ ایسا وقار جو آنکھیں نم نہیں کرتا، مگر دل بھر دیتا ہے۔

یوں یہ مصرع اپنے اختتام پر آکر مکمل نہیں ہوتا، بلکہ قاری کو مکمل کر دیتا ہے۔ "**مَوْلَايَ**" سے شروع ہو کر "**خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ**" تک کا یہ سفر دراصل بندے کو بندگی سے شناخت تک لے آتا ہے۔ کہ جس سے نسبت ہے، وہی معیار ہے؛ اور جس پر درود ہے، وہی میزان۔

یہ قصیدۂ بردہ کے حسن مطلع کا وہ روحانی و عرفانی سفر تھا، جہاں دعا اعلان بنی، محبت معیار بنی اور کائنات نے اپنے خیر کو پہچان لیا۔

اب ہم پورے شعر کو مجموعی فکری، بلاغی اور صوفیانہ محاکے کے طور پر پیش کرتے ہیں ایک جامع اختتامی فصل کی صورت میں۔

یہ شعر اب ٹکڑوں کا مجموعہ نہیں رہا، یہ ایک کامل نظام معنی بن چکا ہے۔ ایسا نظام جس میں ابتدا بھی انجام ہے اور انجام بھی ابتدا۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس پورے شعر کو ایک وحدت میں دیکھا جائے، ویسے ہی جیسے قرآن آیات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک زندہ کلام ہے اور نعت اشعار کی قطار نہیں بلکہ ایک رواں نسبت۔

اس شعر کی فکری ساخت پر غور کیجیے تو یہ عبد سے شروع ہو کر کائنات پر ختم ہوتا ہے۔ "**مَوْلَايَ**" میں فرد ہے، "**صَلِّ وَسَلِّمْ**" میں عمل، "**دَائِمًا أَبَدًا**" میں زمان و ابدیت، "**عَلَى حَبِيبِكَ**" میں مرکز ہدایت، اور "**خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ**" میں پوری مخلوق۔ یہ ترتیب محض ادبی نہیں، عقلی و ایمانی منطق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شعر منطق کے سامنے بھی ٹھہرتا ہے اور عشق کے سامنے بھی۔

بلاغی اعتبار سے یہ شعر حسن مطلع سے حسن مقطع تک ایک مسلسل صعود ہے۔ ندا سے دعا، دعا سے دوام، دوام سے نسبت، نسبت سے افضلیت۔ یہ صنعت حسن ترتیب کی اعلیٰ مثال ہے۔ یہاں کوئی لفظ اضافی نہیں، کوئی معنی کم نہیں۔ ایجاز اور اطناب ایک ہی سانس میں چل رہے ہیں: لفظ مختصر، مفہوم لامحدود۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بدیع، بیان اور معانی تینوں ایک دوسرے میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔

صنائع لفظی و معنوی کی سطح پر یہ شعر خاموشی سے بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔ صنعت ندا، صنعت طلب، صنعت تاکید، صنعت تفضیل، صنعت عموم، صنعت حسن تعلیل، صنعت مراعات النظیر، صنعت لف و نشر، صنعت توازن۔ یہ سب یہاں موجود ہیں،

مگر نمائش کے بغیر۔ یہی اصل کمال ہے: صنعت دکھائی نہیں دیتی، محسوس ہوتی ہے۔ قاری صناعی دیکھتا نہیں، معنی میں ڈوب جاتا ہے۔

لسانی کیفیات پر نگاہ ڈالیں تو عربی کی صوتیات یہاں محض آواز نہیں، روحانی آہنگ بن جاتی ہیں۔ حروف حلقی کی گہرائی، حروف مد کی کشادگی اور وقف کی نرمی۔ یہ سب مل کر بحر بردہ کو صرف وزن نہیں دیتے بلکہ دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔ یہی موسیقیت باطنی ہے، جو نعت کو نظم سے ممتاز کرتی ہے۔

فلسفیانہ سطح پر یہ شعر وجود کے سوال کا جواب ہے۔ اگر خیر کہاں ہے؟ تو جواب ہے: خیر الخلق میں۔ اگر کمال کہاں ہے؟ تو محبوب رب میں۔ اگر معیار کیا ہے؟ تو نسبت مصطفیٰ۔ یہاں فلسفہ الجھتا نہیں، سلجھتا ہے؛ کیوں کہ علت، غایت اور قدر تینوں ایک نقطے پر آکر مل جاتے ہیں۔ یہی فکری توازن ہے، یہی حکمتِ نبوی کا انعکاس۔

صوفیانہ افق پر یہ شعر سلوک کا پورا نقشہ ہے۔ "**مَوْلَايَ**" مقام طلب، "**صَلِّ وَسَلِّمْ**" مقام ذکر، "**دَائِمًا أَبَدًا**" مقام دوام، "**عَلَى حَبِيبِكَ**" مقام توجہ اور "**خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ**" مقام مشاہدہ۔ یوں ایک شعر سالک کو ابتدا سے انتہا تک لے جاتا ہے۔ بغیر خانقاہ، بغیر ریاضت، صرف محبت کے راستے۔

جمالیاتی اعتبار سے یہ شعر نہ جذباتی شور ہے، نہ محض فکری بیان؛ یہ وقار کی جمالیات ہے۔ یہاں حسن چیختا نہیں، ٹھہرتا ہے۔ تاثیر آنسو نہیں مانگتی، خاموش رضامندی پیدا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شعر پڑھ کر دل بے چین نہیں ہوتا، پُر ہو جاتا ہے۔

یوں امام بوصیری کا یہ شعر محض قصیدۂ بردہ کا حصہ نہیں، عقیدے کا خلاصہ ہے، ادب کا معیار ہے اور محبت رسول کی میزان ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں ادب کے رنگ میں کہا جا سکتا ہے کہ: "یہ شعر پڑھا نہیں جاتا۔ یہ شعر میں داخل ہوا جاتا ہے"۔



ہمارا تمہارا رشتہ کیا؟ لا الہ الا اللہ

از: مولانا عارف رضا نیر اشفاقی، جنرل سکریٹری تحریک فروغ اسلام، ہریانہ

متفرقات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآن وحدیث ہمارے لیے ہر موڑ پر مشعل راہ ہیں، ہمیں مقصد حیات کا پتہ انہیں سے معلوم ہوا آپس میں ہمارے تعلقات کس طرح ہونے چاہیے تو قرآن پاک نے بتایا

”اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ“

ترجمہ۔ مسلمان مسلمان بھائی ہیں تو اپنے دو بھائیوں میں صلح کرو اور اللہ سے ڈرو کہ تم پر رحمت ہو (الحجرات آیۃ 10)

اس آیت کریمہ میں ہمارا آپسی رشتہ بتایا گیا اور ہمیں ہماری ذمہ داری سے اگاہ کیا گیا، ساتھ ہی تقوی کا حکم دیا گیا ہے۔ ان تینوں باتوں پر ہمیں غور کرنا ہے

آپس میں ایمانی رشتہ:

قران پاک میں جب فرما دیا گیا کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں تو بھائیوں کا کام آپس میں محبت سے رہنا ہے ایک دوسرے کے درد کو سمجھنا ہے ان کا ایمانی رشتہ اتنا مضبوط ہے کہ اس میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی ہر رشتہ سے اعلی یہی رشتہ ہے جن کے احساس کو وطن کی سرحدیں بھی نہیں روک سکتیں ہاں ہاں قلب مومن کی ہر طرف یہی آواز سنائی دیتی ہے ”ہمارا تمہارا رشتہ کیا؟ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم“ یقینا یہ ایمانی رشتہ دنیاوی رشتوں سے افضل و اعلی ہے حفیظ جالندھری کہتے ہیں۔

محمد کی محبت خون کے رشتوں سے بالا ہے
یہ رشتہ دنیوی قانون کے رشتوں سے بالا ہے

سچ یہی ہے کہ ہمارا ایمانی رشتہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی سے شروع ہوتا ہے اگر یہ نہیں تو کچھ نہیں۔

محمد کی محبت دین حق کی شرط اول ہے
اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نا مکمل ہے

ہم تو دوستی اور بھائی چارے کا معیار اسی کو مانتے ہیں کہ جو مصطفی جان رحمت صلی اللہ تعالی علیہ والہ وسلم کا ہے وہ ہمارا ہے ڈاکٹر اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ ہم آپس میں بھائی بھائی ہیں مگر ہمیں آپس میں کیسے رہنا چاہیے حدیث پاک میں اسے یوں سمجھایا گیا ہے ملاحظہ فرمائیں

مَثَلُ المؤمنينَ في تَوادِّهم ، وتَرَاحُمِهم ، وتعاطُفِهِمْ ۔ مثلُ الجسَدِ إذا اشتكَى منْهُ عضوٌ تدَاعَى لَهُ سائِرُ الجسَدِ بالسَّهَرِ والْحُمَّى۔

ترجمہ۔ مسلمانوں کی مثال آپس میں ایک دوسرے سے محبت ایک دوسرے کے ساتھ رحم دلی اور ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی اور نرمی برتنے میں ایک جسم کی مثال ہے جب اس کے ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو باقی سارا جسم بھی بیداری اور بخار کے ساتھ اس کی وجہ سے بے چین رہتا ہے۔(بخاری شریف 6011. مسلم شریف2586)

اسی طرح کی ایک اور حدیث مسلم شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الْمُسْلِمُونَ كَرَجُلٍ واحِدٍ، إنِ اشْتَكَى عَيْنُهُ، اشْتَكَى كُلُّهُ، وإنِ اشْتَكَى رَأْسُهُ، اشْتَكَى كُلُّهُ.

مسلمان آپس میں ایک آدمی کی طرح ہے اگر اس کی انکھ میں تکلیف ہو تو سارے جسم کو تکلیف ہوتی ہے اور اگر سر میں تکلیف ہو تو اس کے سارے جسم کو تکلیف ہوتی ہے (مسلم شریف2586) معلوم ہوا جیسا کہ ایک انسان کے الگ الگ اعضاء ہیں مگر اس طرح کے ایک کو تکلیف ہوتی ہے تو دوسرے اعضاء بھی پریشان ہوتے ہیں اسی طرح مسلمان کی مثال ہے کہیں بھی کسی مسلمان پر پریشانی آئے تو سچا مومن حدیث پاک کی روشنی میں وہی ہے جو اپنے بھائی کی پریشانی سن کر، دیکھ کر پریشان ہو جائے، بے قرار ہو جائے ایک مسلمان کو ایسا ہونا چاہیے کہ نہ وہ اپنے کسی مسلمان بھائی پر ظلم کرے اور نہ اس پر ظلم ہونے دے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں آیا ہے

المسلمُ أخو المسلمِ لا يَظلِمُه ولا يُسلِمُه۔

ترجمہ .ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے پس اس پر ظلم نہ کریں اور نہ ظلم ہونے دے۔(بخاری شریف2442)اہل فلسطین غزہ میں پریشان ہیں مگر ان کی پریشانی کی وجہ سے ہر مسلمان بے چین و بے قرار نظر اتا ہے یہی ایک سچے مومن کی پہچان ہے۔ اللہ تعالی قبلہ اول کو آزادی نصیب فرمائے آمین

ہمیں آپس میں کس طرح رہنا چاہیے؟ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے تفصیلا ارشاد فرمایا

"لَا تَحَاسَدُوا، وَلَا تَنَاجَشُوا، وَلَا تَبَاغَضُوا، وَلَا تَدَابَرُوا، وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَيْعِ بَعْضٍ، وَكُونُوا عِبَادَ اللَّهِ إِخْوَانًا. الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ، وَلَا يَخْذُلُهُ، وَلَا يَكْذِبُهُ، وَلَا يَحْقِرُهُ. التَّقْوَى هَاهُنَا وَيُشِيرُ إِلَى صَدْرِهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ بِحَسْبِ امْرِئٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ، كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ: دَمُهُ، وَمَالُهُ، وَعِرْضُهُ"

ترجمہ: آپس میں ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، دھوکہ نہ دو، بغض نہ رکھو، اور ایک دوسرے سے منہ نہ موڑو۔ کوئی شخص دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرے۔ اور اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن کر رہو۔ مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس پر ظلم نہیں کرتا، نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے، نہ اس سے جھوٹ بولتا ہے، نہ اسے حقیر سمجھتا ہے۔ آپ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے اپنے سینہ اقدس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تین بار فرمایا "تقویٰ یہاں ہے" کسی شخص کے برے ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون، مال اور عزت حرام ہے۔ (صحیح مسلم:2564)

یہ حدیث اخوت، باہمی محبت، اور مسلمانوں کے حقوق کے بارے میں ہے۔ حسد، دھوکہ، نفرت اور دوسروں کی تحقیر سے بچنا چاہیے۔ مسلمانوں کو آپس میں بھائی چارے کے ساتھ رہنا چاہیے۔

مسلمان کی تعریف کرتے ہوئے آقائے دوجہاں صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا۔ الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِن لِسانِهِ ويَدِهِ، (متفق علیہ)

ترجمہ۔ مسلمان وہ ہے کہ جس کے زبان وہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ یعنی سچا مسلمان وہی ہے جس کے ہر طرح کے شر سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ" "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن کامل نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہ نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ (صحيح البخاري 13)۔ ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان کی خیر خواہی کرتے ہوئے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ضرور انجام دینا چاہیے مگر نیت ذلیل کرنے کی نہ ہو اصلاح کی ہو۔ کتنی پیاری تمثیل دی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے "المؤمنُ مِراةُ المؤمن" ۔ مومن مومن کا آئینہ ہے۔ جس طرح آئینہ ہمیں ہماری اچھائی برائی دونوں دکھاتا ہے ہمیں بھی چاہیے کہ ایک دوسرے کو اچھائی اور برائی کا احساس کرائیں جس طرح آئینہ ہماری برائی صرف ہمیں دکھاتا ہے کسی اور کو نہیں ایسے ہی ہم بھی اپنے مسلمان بھائی کی برائی صرف اسے بتائیں کسی مجلس میں بتا کر اسے ذلیل نہ کریں یہی اصل اصلاح ہے اور جس طرح کہ ہم آئینہ کے بتانے پر اس کا شکریہ ادا کر کے فورا اپنی اصلاح کر لیتے ہیں ویسے ہی ہمیں بھی اپنے مومن بھائی کے بتانے پر متنبہ کرنے پر فورا اپنی اصلاح کرنی چاہیے اور اپنے بھائی کا شکریہ بھی ادا کریں۔ آئینہ منہ کی بات منہ پر کہتا ہے دل میں کچھ نہیں رکھتا مؤمن کو بھی چاہیے کہ کسی کو غلطی پر تنبیہ کرنے کے بعد دل میں کچھ نہ رکھے دل کو صاف

رکھے جس طرح آئینہ اپنے سامنے کھڑے شاہ وگدا میں تمیز نہیں کرتا بے باک ہوتا ہے بے خوف وخطر حقیقت کا اظہار کرتا ہے ایک مؤمن کو بھی چاہیے کہ وہ آئینہ کی طرح بے باک ہو کسی شخصیت سے مرعوب نہ ہو بلکہ اس کی شرعی گرفت کرے آئینہ زبان حال سے یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے۔

میں آئینہ ہوں دکھاؤں گا داغ چہرے کے
جسے خراب لگے سامنے سے ہٹ جائے

اور آئینہ صفت کی شان یہ ہے۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

ہماری ذمہ داری صلح کرانا:

مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں مگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بتقاضہ بشری آپس میں تنازع ہو جاتا ہے جنگ وجدال کی صورت پیدا ہو جاتی ہے تو اس وقت اللہ نے ہماری جو ذمہ داری لگائی ہے ہم اسے پورا کریں اور وہ ذمہ داری یہ ہے کہ جب ہم یہ صورت دیکھیں کہ ہمارے بھائیوں کے درمیان اختلاف ہو گیا ہے تو ہم تماشائی نہ بنے رہیں بلکہ ان کے درمیان صلح کرائیں تنازع ختم کر کے انہیں شیر وشکر کرنے کی کوشش کریں لیکن افسوس صد افسوس کہ آج ہم اپنے بھائیوں کے اختلاف سے خوش نظر آتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اختلاف کرانے کی راہیں تلاش کرتے ہیں تبھی اس کا نتیجہ بد امنی کی صورت میں ہمیں دیکھنے کو مل رہا ہے اگر ہم نے اپنی صلح کرانے والی ذمہ داری کو نبھایا ہوتا تو امن وشانتی کا ہر چہار جانب ماحول ہوتا محبت کی فضا قائم ہوتی اللہ کو معافی مانگنے والے اور معاف کرنے والے دونوں پسند ہیں ہر گز کسی کا دل نہ دکھائیں مومن کا دل خوش کرنا حج اکبر ہے اور کسی مومن کا دل دکھانا ہزار کعبہ ڈھانے سے برا ہے مولائے روم نے اسی کو شعری قالب میں یوں بیان کیا ہے

دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

حکم ہے وَاتَّقُوا اللّٰهَ:

ہمیں آیت کریمہ میں "وَاتَّقُوا اللّٰهَ" کا حکم ملا ہے، یہی تصوف کی اساس ہے، اس کے بغیر کچھ نہیں ہے۔

ڈرنا ہے تو اک اللہ سے ڈر مرنا ہے تو اس کی راہ میں مر
رکھ اس کی رضا پہ اپنی نظر پھر ساری دنیا تیری ہے

جو مؤمن متقی ہوتا ہے، وہی ولی ہوتا ہے، قرآن مجید میں ولی کی تعریف یہ کی گئی ہے الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۔

امام شافعی علیہ الرحمہ تقوی کے بارے میں فرماتے ہیں

عليكَ بِتقْوَى اللهِ إن كنتَ غافِلاً

يَأتِيكَ بالأرزاقِ مِن حيثُ لا تَدْرِي

خلاصہ اس شعر کا یہ کہ اگر تو خواب غفلت میں ہے تو تجھ پر لازم ہے کہ تقوی اختیار کر اور رزق کی فکر نہ کر اللہ تجھے ایسی جگہ سے رزق دے گا کہ جہاں کا تیرا وہم بھی نہ ہو۔ رب کائنات فرماتا ہے "اِنَّ اللّٰهَ يَرۡزُقُ مَنۡ يَّشَآءُ بِغَيۡرِ حِسَابٍ۔

ہماری زندگی میں تقوی آجائے گا تو ہم ضرور حلال و حرام کی تمیز کریں گے کیونکہ جب معلوم ہو گا کہ ایک حرام لقمہ چالیس دن کی بے دکھاوا عبادت کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔

تو پھر اسے مؤمن کبھی اپنے لبوں کے قریب نہیں لے جائے گا اور تقوی کی برکت سے یہ سر نہاں سمجھ میں آئے گا۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

❁❁❁❁❁

نماز عید الفطر سے پہلے طاق کھجوریں کھانا

حضرتِ سَیِّدُنا اَنس رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنۡہُ سے ہے کہ عید الفطر کے دِن) نمازِ عید کیلئے (تشریف نہ لے جاتے جب تک چند کھجوریں نہ تناول فرمالیتے اور وہ طاق ہوتیں۔ (بُخاری ج ۱ ص ۳۲۸ حدیث ۹۵۳)

نماز عید کے لیے جانے اور واپس آنے کا طریقہ

حضرتِ سَیِّدُنا ابوہریرہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنۡہُ سے رِوایت ہے کہ نبیِّ رَحمت، شفیعِ امّت، شَہَنْشاہِ نُبُوَّت، تاجدارِ رسالت صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وسلَّم عید کو) نمازِ عید کیلئے (ایک راستے سے تشریف لے جاتے اور دُوسرے راستے سے واپس تشریف لاتے۔ (تِرمِذی ج ۲ ص ۶۹ حدیث ۵۴۱)

رمضان المبارک:
رحمت و مغفرت کے انمول خزانے اور ان کی کنجیاں

متفرقات

از: محمد فداء المصطفیٰ قادری، دارالھدیٰ اسلامک یونیورسٹی

روزہ دار ہمیشہ اس تلاش میں رہتے ہیں کہ انہیں ایسے قیمتی خزانے میسر آئیں جن سے وہ اپنی روزمرہ زندگی کو بہتر بنا سکیں، اور رمضان المبارک میں تو یہ جستجو مزید بڑھ جاتی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ روحانی فائدہ حاصل کیا جا سکے۔ یہ خزانے سونے چاندی کے نہیں بلکہ خیر، رحمت، مغفرت اور برکت کے انمول ذخائر ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے روزہ دار بندوں کو یہ عظیم نعمتیں ماہِ رمضان میں اس لیے عطا فرماتا ہے تاکہ وہ زندگی کے ہر موڑ پر ان سے رہنمائی اور تقویت حاصل کر سکیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جہاں خزانے ہوتے ہیں وہاں ان کی حفاظت کا بھی خاص انتظام کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خزانے بھی مضبوط تالوں میں بند رکھے گئے ہیں اور ان کے کھلنے کے لیے مخصوص کنجیاں درکار ہوتی ہیں۔ خیر و رحمت اور بخشش و برکت کے ان خزانوں کی کنجیاں روزوں کے اندر پوشیدہ رکھی گئی ہیں۔ جس نے ان کنجیوں کو پالیا، گویا اس نے ان بیش بہا خزانوں تک رسائی حاصل کر لی، کیونکہ جب کنجیاں ہاتھ میں ہوں تو تالوں کو کھولنا کوئی مشکل کام نہیں رہتا۔

آیئے، انہی خزانوں اور ان کی کنجیوں پر کچھ سنجیدگی سے غور کریں تاکہ ہم اس بابرکت مہینے سے بھرپور فائدہ اٹھا سکیں اور اپنی دنیا و آخرت کو سنوار سکیں۔

پہلی کنجی: بے حد و حساب اجر

روزہ دار کے لیے ضروری ہے کہ وہ روزے کی عظمت اور اس کے بے مثال اجر و ثواب کو اچھی طرح سمجھے اور اسے حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کرے۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ جس عمل کا اجر جتنا زیادہ ہوتا ہے، اس کے آداب اور تقاضے بھی اتنے ہی بلند ہوتے ہیں۔ اسی حقیقت کی وضاحت حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ابنِ آدم کا ہر عمل اسی کے لیے ہے، سوائے روزے کے، کیونکہ روزہ خاص میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ عطا کروں گا۔ روزہ انسان کے لیے ایک مضبوط ڈھال ہے، لہٰذا جب تم میں سے کوئی روزہ رکھے تو وہ بے ہودہ باتوں، گالی گلوچ اور شور و شغب سے بچے۔ اگر کوئی اس سے جھگڑا کرے یا بدزبانی کرے تو وہ نرمی سے کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے، روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک کستوری کی خوشبو سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے۔ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں مقرر کی گئی ہیں: ایک افطار کے وقت، جب وہ روزہ کھولتا ہے، اور

دوسری اس وقت جب وہ اپنے رب کے حضور پیش ہوگا اور اپنے روزے کی بدولت خوشی محسوس کرے گا (متفق علیہ)۔ یہ روایت بخاری میں اس طرح آئی ہے، جبکہ روایت میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں کہ "وہ اپنی خواہشات اور کھانے پینے کو صرف میری رضاکے لیے ترک کرتا ہے"۔

روزے کی فضیلت اور اس کے عظیم اجر کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "جس شخص نے ایمان اور خلوص کے ساتھ رمضان کے روزے رکھے، اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں"۔ (بخاری و مسلم)

اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: "جس نے ایمان و احتساب کے جذبے کے ساتھ رمضان کی راتوں میں قیام کیا، اس کے گزشتہ گناہ بخش دیے جاتے ہیں"۔ (مسلم)

مزید ارشاد فرمایا: "جنت میں ایک خاص دروازہ ہے جسے ریّان کہا جاتا ہے، قیامت کے دن اس دروازے سے صرف روزہ دار ہی داخل ہوں گے، ان کے علاوہ کوئی اور اس میں سے گزرنے کا حق دار نہ ہوگا۔ اعلان کیا جائے گا: روزہ دار کہاں ہیں؟ چنانچہ وہ کھڑے ہوں گے اور اسی دروازے سے جنت میں داخل ہوں گے، پھر وہ دروازہ بند کر دیا جائے گا اور کوئی دوسرا اس میں سے داخل نہ ہو سکے گا"۔ (بخاری و مسلم)

اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے"۔ (بخاری و مسلم)

روزے کے اجر و ثواب کی یہ عظمت اور شان جب روزہ دار کے دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے تو اس کے اندر اس اجر کے حصول کی شدید خواہش بیدار ہو جاتی ہے، جو اسے مزید محنت، لگن اور جدوجہد پر آمادہ کرتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے تمام اعمال میں شریعت کے آداب کی مکمل پاسداری کرتا ہے اور اپنی زندگی کو رسولِ اکرم ﷺ کی سنت کے مطابق ڈھالنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔

دوسری کنجی: تقویٰ

روزے کا بنیادی مقصد تقویٰ پیدا کرنا ہے، اس لیے روزہ دار کو یہ سمجھنا چاہیے کہ روزے اور تقویٰ کے درمیان کس قدر گہرا اور مضبوط تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے، تاکہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو"۔ (البقرۃ:183)

اس آیتِ مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ روزے کی اصل روح اور اس کا حقیقی ہدف انسان کے اندر تقویٰ کو پروان چڑھانا ہے۔

تقویٰ کے نہایت سادہ اور جامع معنی یہ ہیں کہ انسان وہاں نہ جائے جہاں اللہ تعالیٰ نے جانے سے منع فرمایا ہو اور جہاں رہنے کا حکم دیا ہو وہاں سے غفلت اختیار نہ کرے۔ دوسرے لفظوں میں تقویٰ یہ ہے کہ روزہ دار پوری ہوشیاری اور ذمہ داری کے ساتھ

اپنی عبادت اور اپنے اخلاق کی حفاظت کرے، تاکہ کوئی ایسا عمل سرزد نہ ہو جائے جو اس کی نیکیوں کو ضائع کردے۔ جب انسان عبادت کے آداب اور شریعت کے تقاضوں کا اہتمام کرتا ہے تو وہ گناہوں اور نافرمانی سے محفوظ رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ احتیاط اور پرہیز اس کی عادت بن جاتی ہے، جس کے نتیجے میں اس کی زندگی سنور جاتی ہے اور بہتر سے بہترین رخ اختیار کرلیتی ہے۔ اور اگر کبھی لغزش ہو بھی جائے تو وہ فوراً سچی توبہ کرکے خود کو گناہوں کی آلودگی سے پاک کرلیتا ہے۔

جب انسان روزے کی اصل روح اور اس کی حقیقی حقیقت کو پالیتا ہے تو وہ تقویٰ کے حصول کے لیے پوری سنجیدگی اور دل جمعی کے ساتھ کوشش کرنے لگتا ہے۔ روزہ محض بھوک اور پیاس برداشت کرنے یا خواہشاتِ نفس سے وقتی طور پر رک جانے کا نام نہیں، بلکہ اس کا مقصد انسان کو گناہ و معصیت کی تاریکی سے بچانا اور اسے ضبطِ نفس اور اطاعت کا خوگر بنانا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اس حقیقت کو نہایت بلیغ انداز میں یوں واضح فرمایا: ”جو شخص جھوٹی بات کہنا اور اس پر عمل کرنا نہیں چھوڑتا، تو اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانا پینا ترک کرنے کی کوئی حاجت نہیں“۔ (بخاری)

پس اگر روزہ دار کو تقویٰ کی یہ کنجی نصیب ہو جائے تو وہ ایک ایسے عظیم روحانی خزانے کا حق دار بن جاتا ہے جو قیامت کے دن اس کے نامۂ اعمال کو نور، حسن اور تابانی سے بھر دے گا اور اس کی نجات و سرخروئی کا سبب بنے گا۔

تیسری کنجی: تعمیرِ سیرت و کردار

ذرا اس نکتے پر سنجیدگی سے غور کیجیے کہ روزے صرف ”چند دنوں“ یعنی ایک پورے مہینے کے لیے کیوں مقرر کیے گئے ہیں؟ یہ مدت نہ اس سے کم رکھی گئی اور نہ زیادہ، اس کے پیچھے گہری حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ اس غور و فکر سے روزہ دار پر روزے کی اصل غرض و غایت، یعنی تقویٰ کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی آشکار ہوتی ہے کہ عبادت کا انسانی ارادے سے نہایت مضبوط تعلق ہے، کیونکہ انسان جن اعمال اور عبادات کا عادی بن جاتا ہے، انہیں اختیار کرنا یا چھوڑ دینا اسی کے پختہ ارادے پر منحصر ہوتا ہے۔ روزہ دار فجر سے مغرب تک اپنی بنیادی ضروریات ترک کردیتا ہے اور اپنی روزمرہ عادات میں نمایاں تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ عادت کو بدلنا کوئی آسان کام نہیں، بلکہ اس کے لیے مسلسل مشق، صبر اور وقت درکار ہوتا ہے۔ اسلامی شریعت میں انسانی ارادے کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، کیونکہ جس شخص میں مضبوط ارادہ نہ ہو وہ اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے سے قاصر رہتا ہے۔ حضرت علی نے انسانی ذمہ داری کی حقیقت کو یوں بیان فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے کسی کو زبردستی مکلف نہیں بنایا، نہ انبیا کو بے مقصد بھیجا، بلکہ اس نے حکم دیا اختیار کے ساتھ اور منع فرمایا تنبیہ اور ڈراوے کے ساتھ۔“

جب انسان اپنی بری عادات کو چھوڑ کر اچھی اور پسندیدہ عادات اپنا لیتا ہے، اپنے نادرست طرزِ عمل کو درست راہ پر لے آتا ہے اور اپنے کردار کو سنوار لیتا ہے تو درحقیقت وہ ایک عظیم خزانے کی کنجی حاصل کرلیتا ہے۔ ہم ہر سال یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ رمضان کی آمد کے ساتھ ہی لوگ اپنے اندر مثبت تبدیلیاں لانے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اگر ایک مسلمان روزوں کے اس

تربیتی عمل سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ارادے کو مضبوط کرے اور اسے بہتر رخ پر ڈالنے کی کوشش کرے تو اس کی زندگی میں ایک زبردست اور ہمہ گیر انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔

چوتھی کنجی: روزہ اور آسانی

اگرچہ روزہ دار کے لیے بے شمار اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلامی شریعت کی ایک نمایاں اور روشن خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آسانی اور سہولت کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں اتنی ہی گنتی پوری کر لے، اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں (پھر بھی نہ رکھ سکیں) تو وہ فدیہ دیں، یعنی ایک مسکین کو کھانا کھلائیں“۔ (البقرۃ:184)

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام انسان کی کمزوریوں اور مجبوریوں کو پیشِ نظر رکھ کر اسے سہولت فراہم کرتا ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ نے بھی امت کے لیے آسانی کے اصول کو عملی صورت میں پیش فرمایا۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ”اگر تم میں سے کوئی بھول کر کھا پی لے تو وہ اپنا روزہ پورا کرے، کیونکہ اسے اللہ ہی نے کھلایا اور پلایا ہے“۔ (متفق علیہ)

حضرت عائشہ بیان فرماتی ہیں کہ بعض اوقات رسول اللہ ﷺ فجر کے وقت حالتِ جنابت میں ہوتے اور غسل کرنے کے بعد روزہ رکھ لیتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

اسی طرح قرآنِ مجید میں فرمایا گیا: ”تمہارے لیے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے، وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔ اللہ نے جان لیا کہ تم اپنے ساتھ خیانت کر رہے تھے، تو اس نے تمہاری توبہ قبول فرمائی اور تم سے درگزر کیا“۔ (البقرۃ:187)

یہ آسانیاں انسان کو اطاعت اور فرماں برداری پر قائم رہنے کی ترغیب دیتی ہیں اور اسے اسلامی قانون سازی کی حکمت و رحمت سے بھی آگاہ کرتی ہیں۔ روزے دراصل سزا نہیں بلکہ انسانی ارادے کی تربیت، ضبطِ نفس کی مشق اور اطاعت کا خوگر بنانے کا ایک مؤثر ذریعہ ہیں۔ اسی تربیت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان دوسروں کے ساتھ معاملات میں نرمی اور آسانی کا رویہ اختیار کرے، کیونکہ روزے ہمیں یہی سبق دیتے ہیں کہ سہولت، رحمت اور درگزر ہی اصل اسلامی مزاج ہے۔

پانچویں کنجی: قرآنِ مجید

رمضان المبارک قرآنِ کریم کے نزول کا مہینہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، جو تمام انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے، اور ایسی روشن تعلیمات پر مشتمل ہے جو سیدھی راہ دکھانے والی اور حق و باطل میں واضح امتیاز کرنے والی ہیں۔ لہٰذا جو شخص اس مہینے کو پائے، اس پر لازم ہے کہ وہ اس کے روزے رکھے“۔ (البقرۃ:185)

اس آیتِ مبارکہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ قرآن پوری انسانیت کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ہے اور اس عظیم نعمت کے نزول کے لیے اللہ تعالیٰ نے رمضان جیسے بابرکت مہینے کو منتخب فرمایا۔

جو شخص حقیقی ترقی اور کامیابی کا خواہاں ہو، اس کے لیے قرآن ہی سب سے بڑا سہارا اور رہنما ہے۔ روزہ دار اگر قرآن سے اپنا رشتہ مضبوط کرلے تو وہ دنیا و آخرت دونوں میں بلندی کی منازل طے کر سکتا ہے۔ حضرت عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے بعض قوموں کو سربلندی عطا فرماتا ہے اور اسی کتاب کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے بعض کو ذلت اور پستی میں مبتلا کر دیتا ہے“۔ (مسلم)

لہٰذا رمضان میں کثرت کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرنی چاہیے، اس کے معانی میں غور و فکر کرنا چاہیے اور اس کی ہدایات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہر حرف پر نیکی ملتی ہے اور ہر نیکی کا اجر دس گنا بڑھا دیا جاتا ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔ حضرت عثمان بن عفان سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ”تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن سیکھے اور دوسروں کو سکھائے“۔ (بخاری)

درحقیقت یہ عظیم کتاب دنیا اور آخرت دونوں میں ترقی اور فلاح کا ذریعہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”قیامت کے دن قرآن والے سے کہا جائے گا: پڑھتا جا اور ترقی کرتا جا، اسی طرح ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسے تو دنیا میں پڑھا کرتا تھا، تیری آخری منزل وہ ہوگی جہاں تیری آخری آیت ختم ہوگی“۔ (ترمذی، ابوداؤد)

رمضان اور قرآن کا یہ گہرا تعلق روزہ دار کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ اس کتابِ ہدایت سے بھرپور استفادہ کرے، اسے پڑھے، سمجھے، سیکھے، سکھائے اور اس کی تعلیمات پر عمل کرے، تاکہ وہ حقیقی ترقی، روحانی بلندی اور دائمی کامیابی سے ہم کنار ہو سکے۔

چھٹی کنجی: قربِ الٰہی

قرآنِ مجید میں روزوں کے فرض ہونے اور ان میں دی گئی آسانیوں کے ذکر کے درمیان ایک ایسی عظیم آیت آئی ہے جسے بعض لوگ روزوں کے موضوع سے الگ سمجھتے ہیں، حالانکہ حقیقت میں یہ آیت روزوں کے سیاق و سباق میں آکر ایک نہایت گہری اور اہم حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہے، لیکن اس حقیقت تک پہنچنے کے لیے تدبر اور غور و فکر ضروری ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

”اور اے نبی ﷺ! میرے بندے جب تم سے میرے بارے میں سوال کریں تو انہیں بتادو کہ میں ان کے بہت قریب ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا سنتا ہوں اور قبول کرتا ہوں۔ لہٰذا انہیں چاہیے کہ وہ میری بات مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں، تاکہ وہ ہدایت پا جائیں“۔ (البقرۃ:186)

جو شخص روزوں کے احکام کی پابندی کرتا ہے اور قرآن کی ہدایات سے روشنی حاصل کرتا ہے، وہ قربِ الٰہی کا مستحق بن جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ رمضان المبارک میں نوافل کی کثرت انسان کو اللہ کے قریب کر دیتی ہے۔ مشہور حدیثِ قدسی میں ارشاد ہے: "میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں"۔

جب روزہ دار کے ہاتھ میں یہ کنجی آجاتی ہے تو اسے دعا کی ضرورت اور اہمیت کا گہرا شعور حاصل ہو جاتا ہے، کیونکہ دعا بذاتِ خود عبادت ہے۔ بندہ جب کثرت سے دعا کرتا ہے تو اس کا رشتہ اپنے رب سے مضبوط ہو جاتا ہے، اور یوں وہ فطری طور پر اللہ کی اطاعت کی طرف مائل ہو جاتا ہے، اس کے احکام کو خوش دلی سے قبول کرتا اور ان پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ دعا دراصل اللہ کی پناہ میں آنا، اسے یاد کرنا اور اس کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار کرنا ہے۔ اور جب بندہ اپنے رب کو یاد کرتا ہے تو ربِ کریم بھی اپنے بندے کو یاد فرماتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: "پس تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا، اور میرا شکر ادا کرو، ناشکری نہ کرو۔"

روزہ دار فرائض اور نوافل کی ادائیگی کے ساتھ تمام نیک اعمال انجام دے کر قربِ الٰہی کا حق دار بن جاتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اسے اپنے قرب کی دولت سے نوازتا ہے اور اس کی دعاؤں کو سنتا اور قبول فرماتا ہے۔ انہی کنجیوں کے ذریعے روزہ دار کو ایسے روحانی خزانے حاصل ہوتے ہیں جو موتیوں اور ہیروں سے بھی کہیں زیادہ قیمتی ہیں۔ ان خزانوں کے دروازے رمضان المبارک میں کھلتے ہیں اور جو لوگ اس مہینے کی روح کو زندہ رکھتے ہیں، ان پر رمضان کے بعد بھی کھلے رہتے ہیں۔ یوں روزہ دار اپنی دنیوی زندگی کے لیے بھی بے شمار فائدے سمیٹ سکتا ہے اور آخرت کی دائمی کامیابی کے لیے بھی عظیم ذخیرہ جمع کر سکتا ہے۔ گویا ان کنجیوں کی بدولت وہ زندگی کے ہر مرحلے میں ترقی کر سکتا ہے اور ان خزانوں سے بھرپور استفادہ کر سکتا ہے۔ اب آئیے دیکھتے ہیں کہ یہ خزانے آخر کون کون سے ہیں؟

پرہیز کے خزانے: جب روزہ دار اطاعتِ الٰہی کو ملحوظ رکھتا ہے، نافرمانی سے اجتناب کرتا ہے، روزوں کے آداب کی پوری پابندی کرتا ہے اور اپنے ارادے کو مضبوط بنالیتا ہے، نیز خود کو بری عادات کی غلامی سے محفوظ رکھتا ہے تو وہ روزے کی فرضیت کے اصل مقصد، یعنی تقویٰ کو حاصل کر لیتا ہے۔ مسلسل مشق اور تربیت کے ذریعے اس میں برے کاموں سے بچنے اور ان سے دور رہنے کی مضبوط صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یوں وہ پرہیز و احتیاط کے انمول خزانوں کا مالک بن جاتا ہے۔ اس صلاحیت کی بدولت وہ اپنے طرزِ عمل کو ہر قسم کی خرابی سے محفوظ رکھتا ہے اور اس پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جب انسان اپنے ارادے کو بروئے کار لا کر حدود کی پابندی کرتا اور ہر قبیح و شر سے بچتا ہے تو اسے پرہیز گاری کا عظیم خزانہ نصیب ہوتا ہے۔ اس سے اس کا اللہ پر بھروسا بڑھتا ہے، خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور پھر شیطان اس پر غالب نہیں آپاتا، نہ ہی وہ اپنے وسوسوں سے اسے گمراہ

کر سکتا ہے۔ یوں روزہ دار کو تقویٰ اور پرہیز گاری کی وہ بے بہا دولت حاصل ہو جاتی ہے جو انسان کو منکرات، نفسانی خواہشات اور گناہوں سے محفوظ رکھتی ہے۔

ترقی کے خزانے: روزہ رکھنے اور راتوں میں قیام کرنے کا اجر و ثواب یقینی اور بے شمار ہے۔ روزہ دار اس کے ثمرات کا دنیا میں بھی امیدوار رہتا ہے اور آخرت میں تو اس کے لیے عظیم اجر کی صورت میں جزا کا ملنا طے شدہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ثواب کی کنجیوں کا گہرا تعلق تلاوتِ قرآن، دعا، قیام اللیل، اعتکاف اور دیگر نیک اعمال سے ہے۔ انہی کنجیوں کے ذریعے روزہ دار کو ایک عظیم روحانی خزانہ حاصل ہوتا ہے، جسے ترقی کا خزانہ کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جب انسان اللہ کے فضل و کرم سے تقویٰ کی دولت سے بہرہ ور ہو جاتا ہے تو وہ ایمان کی حلاوت سے آشنا ہو جاتا ہے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ اس کے لیے سب سے زیادہ محبوب بن جاتے ہیں۔ اور یہ محبت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ انسان تمام فرائض و نوافل کی پابندی کرے اور اطاعت و فرمانبرداری میں بھرپور جدوجہد کرے۔

یہ خزانہ نیک اعمال سے لبریز ہوتا ہے: قرآن کی کثرت سے تلاوت، سنتِ رسول ﷺ کی پیروی میں رمضان کے دوران دل کھول کر سخاوت، روزہ داروں کے لیے افطار کا اہتمام، صلہ رحمی، یتیموں اور محتاجوں کا خیال رکھنا، اور رمضان میں ہر طرح کی نفل عبادات میں اضافہ — یہ سب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت حاصل کرنے کے بہترین ذرائع ہیں۔ ان اعمال کے ذریعے روزہ دار ترقی کی بلند منزلیں طے کرتا ہے اور بالآخر اللہ تعالیٰ کی رضا کا مستحق بن جاتا ہے۔

حبِ الٰہی کے خزانے: جس انسان کو تقویٰ و پرہیز گاری کی دولت نصیب ہو جائے اور اطاعتِ الٰہی میں ترقی کے مواقع میسر آ جائیں، وہی در حقیقت اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات کا مستحق بنتا ہے۔ بندے پر اللہ کی سب سے بڑی اور عظیم ترین عنایت اس کی محبت ہے، اور یہ محبت بندے کے لیے سب سے اعلیٰ انعام اور سب سے بڑی کامیابی ہے۔ حدیثِ قدسی میں ارشاد ہے: ”جب میں اپنے بندے سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں ضرور اسے عطا کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ چاہے تو میں ضرور اسے پناہ دیتا ہوں۔“

روزہ دار اس بات کا آرزومند ہوتا ہے کہ اس نے پورے ماہِ رمضان میں قرآنِ کریم سے جو گہرا تعلق قائم کیا ہے، اس کا بھرپور اجر اسے نصیب ہو۔ وہ لیلۃ القدر کی تلاش میں شب بیداری کرتا ہے تاکہ اسے اس مبارک رات کا نور اور برکت حاصل ہو۔ وہ اعتکاف، عبادت اور آخری عشرے کی مسلسل جدوجہد کا صلہ چاہتا ہے اور امید رکھتا ہے کہ اس کی محنت رائیگاں نہ جائے۔

روزہ دار کی سب سے بڑی تمنا یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جہنم سے نجات عطا فرمائے اور اس کے روزے، عبادات اور دعائیں قبول فرما لے۔ تاہم یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اللہ کے فضل کی یہ امید محض آرزو نہیں، بلکہ عمل، محنت اور سچی جدوجہد کے بعد وابستہ کی جاتی ہے۔ روزہ دار کو عطا ہونے والے یہ تمام خزانے ربِ کریم کے خاص انعامات ہیں، جو اس کے لیے پوری زندگی باعثِ تقویت اور سرمایۂ نجات بن جاتے ہیں۔ دعا کی قبولیت کے لیے بھی وہ انہی خزانوں پر بھروسا کرتا ہے، لیکن یہ تمام امیدیں اسی وقت بارآور ہوتی ہیں جب ان کے ساتھ خلوصِ عمل موجود ہو۔ اسی لیے ارشاد فرمایا گیا: ”لہٰذا انہیں چاہیے کہ میری بات مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں، تاکہ وہ ہدایت پا جائیں۔“



عید الفطر خوشی، شکر اور اخوت کا پیغام

متفرقات

از: حافظ افتخار احمد قادری، کریم گنج، پورن پور، پیلی بھیت

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہ دین جہاں عبادت و ریاضت، زہد و تقویٰ اور مجاہدۂ نفس کا درس دیتا ہے، وہیں خوشی و مسرت، باہمی محبت اور اجتماعی ہم آہنگی کے مواقع بھی عطا کرتا ہے۔ انہی بابرکت اور مسنون مواقع میں سے ایک عظیم موقع "عید الفطر" کا ہے۔ عید الفطر صرف تہوار نہیں بلکہ شکر، اطاعت، ایثار اور اخوت کا جامع پیغام ہے۔ یہ وہ دن ہے جب بندہ ایک ماہ کی ریاضت یا ایک عظیم قربانی کے بعد اپنے رب کے حضور سر بسجود ہو کر اس کی عطاؤں پر شکر بجالاتا ہے اور اجتماعی طور پر اپنی دینی شناخت اور ملی وحدت کا اظہار کرتا ہے۔

لفظ "عید" عربی زبان کے لفظ "عود" سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ لوٹنے کے ہیں۔ یعنی یہ وہ دن ہے جو بار بار خوشیوں اور رحمتوں کے ساتھ لوٹ کر آتا ہے۔ عید الفطر ہو یا عید الاضحیٰ، دونوں ہی مواقع پر مسلمان اپنی بندگی کے سفر کی تکمیل پر خوشی مناتے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

"وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ"۔ (البقرہ:185)

یعنی: تاکہ تم گنتی پوری کرو اور اللہ کی بڑائی بیان کرو اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت دی اور تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ عید دراصل تکمیلِ عبادت پر اللہ کی کبریائی بیان کرنے اور اس کا شکر ادا کرنے کا دن ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے مدینہ طیبہ تشریف لا کر دیکھا کہ لوگ دو دن کھیل کود میں گزارتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

"إِنَّ اللهَ قَدْ أَبْدَلَكُمْ بِهِمَا خَيْرًا مِنْهُمَا: يَوْمَ الْفِطْرِ وَيَوْمَ الْأَضْحَى"۔ (سنن ابی داؤد)

یعنی: اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان دو دنوں کے بدلے ان سے بہتر دو دن عطا فرمائے ہیں، عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔

اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ اسلام خوشی کا مخالف نہیں بلکہ اس نے خوشی کو عبادت اور شکر کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔

عید الفطر دراصل رمضان المبارک کی عبادتوں کا انعام ہے۔ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا، روزے فرض کیے گئے اور شبِ قدر جیسی عظیم رات رکھی گئی۔ ایک مومن جب پورے خلوص کے ساتھ روزے رکھتا ہے، تراویح ادا کرتا ہے، تلاوتِ قرآن کرتا ہے، صدقات و خیرات دیتا ہے اور اپنے نفس کو گناہوں سے روکتا ہے تو عید الفطر کا دن اس کے لیے خوشی اور قبولیت کی امید کا دن بن جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں۔ ایک افطار کے وقت اور دوسری اپنے رب سے ملاقات کے وقت۔ (صحیح بخاری)

عید الفطر کی خوشی دراصل اسی روحانی مسرت کا اظہار ہے۔ اسی طرح عید الاضحیٰ حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی بے مثال اطاعت اور حضرت سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی فرمانبرداری کی یاد تازہ کرتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"فَلَمَّآ أَسْلَمَا وَتَلَّهُۥ لِلْجَبِينِ"۔ (الصافات:103)

یعنی: جب دونوں نے حکمِ خدا کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔

قربانی کا عمل ہمیں یاد دلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اپنی محبوب ترین چیز بھی قربان کی جاسکتی ہے۔ عید الاضحیٰ کی خوشی دراصل اس جذبہ اطاعت اور ایثار کی تجدید کا نام ہے۔

عید الفطر کا پہلا اور بنیادی پیغام شکر کا ہے۔ ایک مومن جانتا ہے کہ اگر اسے رمضان المبارک کی سعادت نصیب ہوئی یا قربانی کی توفیق ملی تو یہ اس کے رب کا فضل ہے۔ شکر فقط زبان سے "الحمد للہ" کہنے کا نام نہیں بلکہ دل کی گہرائی سے نعمت کا اعتراف اور عملی طور پر اطاعتِ الٰہی کا اظہار ہے۔ امام احمد رضا خان فاضلِ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے شکر کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:"بندہ ہر نعمت کو من جانب اللہ سمجھے اور اس کو اسی کی رضا میں استعمال کرے یہی حقیقی شکر ہے۔"

عید کا دوسرا اہم پہلو اخوت اور مساوات ہے۔ عید گاہ میں امیر و غریب، حاکم و محکوم، عالم و عامی سب ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر دو رکعت نماز ادا کرتے ہیں۔ یہ منظر اسلامی مساوات کا عملی نمونہ ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ"۔ (الحجرات:10)

یعنی: مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

عید الفطر کا دن اس اخوت کو تازہ کرنے کا دن ہے۔ باہمی رنجشوں کو ختم کرنا، ایک دوسرے کو معاف کرنا، گلے ملنا اور دلوں کو صاف کرنا اسی پیغام کا عملی اظہار ہے۔ اسلام نے عید کی خوشی کو صرف ذاتی مسرت تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے اجتماعی خوشی بنایا ہے۔ اسی لیے عید الفطر سے پہلے صدقہ فطر واجب قرار دیا گیا تاکہ معاشرے کا کوئی فرد بھوکا نہ رہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ صدقۂ فطر روزوں کی لغزشوں کا کفارہ اور مساکین کے لیے کھانے کا ذریعہ ہے۔ (سنن ابی داوٗد)

اس حکم کے ذریعے اسلام نے یہ پیغام دیا کہ تمہاری خوشی اس وقت مکمل ہوگی جب تمہارے آس پاس کے ضرورت مند بھی خوش ہوں گے۔ بدقسمتی سے آج عید کا تصور کئی جگہوں پر ظاہری نمود و نمائش اور اسراف تک محدود ہوتا جارہا ہے۔ مہنگے لباس، فضول خرچی، آتش بازی اور غیر شرعی رسومات نے اس کی روح کو مجروح کر دیا ہے۔ حالانکہ عید کا اصل حسن سادگی، پاکیزگی اور سنت کی پیروی میں ہے۔ نبی کریم ﷺ عید کے دن غسل فرماتے، عمدہ لباس زیب تن کرتے، خوشبو استعمال فرماتے اور عید گاہ تشریف لے جاتے۔ (سنن ابن ماجہ) مگر اس میں تکبر، فخر یا اسراف کا شائبہ نہ ہوتا۔

عید الفطر ہمیں یہ بھی یاد دلاتی ہے کہ مسلمان کی خوشی حدودِ شریعت کے اندر ہوتی ہے۔ نہ اس میں بے حیائی ہے، نہ لہو و لعب کی زیادتی، نہ اخلاقی بے راہ روی۔ بلکہ یہ خوشی ذکرِ الٰہی، تکبیرات، نماز اور دعاؤں سے مزین ہوتی ہے۔ عید الفطر کی رات کو بھی عبادت کی ترغیب دی گئی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: جس نے عیدین کی راتوں کو ثواب کی نیت سے قیام کیا اس کا دل اس دن نہ مرے گا جس دن دل مر جائیں گے۔ (سنن ابن ماجہ)

قارئین! اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اہلِ سنت وجماعت کے نزدیک ہر دینی موقع سنت کی روشنی میں منایا جاتا ہے۔ عید بھی اسی سنت کی جلوہ گاہ ہے۔ تکبیراتِ تشریق کی صدائیں، درود و سلام کی خوشبو، علمائے اہلِ سنت کے بیانات اور باہمی ملاقاتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہماری عید محض ثقافتی تقریب نہیں بلکہ ایمانی کیفیت کا اظہار ہے۔ آج جب دنیا نفرتوں، تعصبات اور تقسیم در تقسیم کا شکار ہے، عید الفطر کا پیغام پہلے سے کہیں زیادہ اہم ہو گیا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم عید الفطر کو اپنے کردار کی اصلاح کا ذریعہ بنائیں۔ اگر رمضان المبارک کے بعد بھی ہماری نمازوں میں پابندی، زبان میں پاکیزگی، معاملات میں دیانت اور دلوں میں محبت باقی رہے تو یہی عید الفطر کی حقیقی کامیابی ہے۔ اگر قربانی کے بعد بھی ہمارے اندر ایثار، صبر اور اطاعت کا جذبہ زندہ رہے تو یہی عید الاضحیٰ کی روح ہے۔ عید کا دن ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ بندگی کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ ایک رمضان المبارک کے بعد دوسرا رمضان آئے گا، ایک عید کے بعد دوسری عید، مگر سوال یہ ہے کہ کیا ہم ہر سال روحانی طور پر آگے بڑھ رہے ہیں یا وہیں کھڑے ہیں؟ عید الفطر دراصل احتساب کا بھی دن ہے کہ ہم نے اپنی عبادتوں سے کیا پایا اور اپنی زندگی میں کیا بدلا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عید کی حقیقی روح کو سمجھنے، شکر و اطاعت کی راہ پر قائم رہنے، اخوت و محبت کو فروغ دینے اور سنتِ مصطفیٰ ﷺ کے مطابق اپنی خوشیوں کو منانے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہماری عیدیں ظاہری مسرت کے ساتھ باطنی نورانیت کا بھی ذریعہ بنیں اور ہم دنیا و آخرت کی حقیقی کامیابی حاصل کرنے والوں میں شامل ہوں۔ الغرض! عید الفطر کا حقیقی مفہوم صرف نئے کپڑے پہن لینے، میٹھے پکوان تیار کر لینے اور رسمی مبارک باد کے تبادلوں تک محدود نہیں ہے۔ اگر دل کی دنیا ویران ہو، رشتوں میں دراڑیں موجود ہوں، بھائی بھائی سے ناراض ہو، خاندان آپسی رنجشوں کا شکار ہو اور معاشرہ حسد و کینہ اور بدگمانی کی آگ میں جل رہا ہو تو پھر ہم کس عید کی خوشی منا رہے ہیں؟ کیا یہ وہی عید ہے جس کے لیے ایک ماہ تک ہم نے اپنے نفس کو بھوک و پیاس کے ذریعے قابو میں رکھا؟ کیا یہ وہی عید ہے جس کے لیے ہم نے شب بیداریاں کیں، آنسو بہائے، دعائیں مانگیں اور مغفرت کی امیدیں وابستہ کیں؟ رمضان المبارک کا مقصد صرف ظاہری عبادت نہ تھا بلکہ دل کی اصلاح، باطن کی تطہیر اور اخلاق کی تعمیر تھا۔ اگر رمضان المبارک کے بعد بھی ہمارے دلوں میں بغض باقی ہے، اگر ہم معاف کرنے کے بجائے بدلہ لینے کے جذبے کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں، اگر ہم دوسروں کی خوشی دیکھ کر جلتے ہیں اور دوسروں کی کامیابی پر افسوس کرتے ہیں تو ہمیں اپنے گریبان میں جھانکنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ عید الفطر دراصل صاف دلوں کی عید ہے، ٹوٹے رشتوں کو جوڑنے کی عید ہے، نفرتوں کو دفن کرنے اور محبتوں کو زندہ کرنے کا دن ہے۔ سوچیے! عید گاہ میں ہم سب ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ نہ وہاں کسی کی دولت کا امتیاز رہتا ہے نہ عہدے کا غرور۔ سب کے سر ایک ہی رب کے حضور جھکے ہوتے ہیں، سب کی زبانوں پر تکبیرات جاری ہوتی ہیں، سب کی آنکھوں میں خوشی کی چمک ہوتی ہے۔ لیکن اگر اسی نماز کے بعد ہم دل میں کسی کے لیے کینہ پالے رکھیں تو کیا یہ اس اجتماع کی روح کے خلاف نہیں؟ قرآن مجید نے بارہا دلوں کی صفائی کی تعلیم دی ہے۔ اللہ تعالیٰ دلوں کے حال کو جانتا ہے۔ اگر عید الفطر کے دن بھی ہمارا دل کسی مسلمان بھائی کے خلاف بغض سے بھرا ہو تو ہمیں ڈرنا چاہیے کہ کہیں ہماری عبادتوں کا نور اسی تاریکی میں گم نہ ہو جائے۔ حقیقی عید وہ ہے جس میں انسان سب سے پہلے اپنے دل کو صاف کرے۔ جس سے ناراضی ہو اسے معاف کرے، جس سے تعلق ٹوٹا ہو اسے جوڑے، جس کے ساتھ زیادتی

ہوئی ہو اس سے معذرت کرے۔ نبی کریم ﷺ کی سیرت ہمیں یہی درس دیتی ہے کہ آپ نے بدترین دشمنوں کو بھی معاف فرمایا۔ اگر ہم حضور ﷺ کے امتی ہیں تو ہمیں بھی عید کے دن اپنے دل کو وسعت دینی ہوگی۔ محض گلے مل لینا کافی نہیں جب تک دل بھی نہ مل جائیں۔ محض عید مبارک کہہ دینا کافی نہیں جب تک ہم سچی نیت سے خیر خواہی نہ کریں۔

افسوس! کہ آج بعض مقامات پر عید مقابلہ آرائی کا ذریعہ بن گئی ہے۔ کون زیادہ قیمتی لباس پہنے، کس کے گھر زیادہ مہمان آئیں، کس نے زیادہ شان و شوکت دکھائی۔ یہ سب چیزیں اصل مقصد کو پسِ پشت ڈال دیتی ہیں۔ حالانکہ عید کا اصل حسن سادگی، عاجزی اور باہمی محبت میں ہے۔ اگر ہماری عید کسی غریب کے احساسِ محرومی میں اضافہ کر دے، کسی رشتہ دار کے دل کو دکھا دے یا کسی پڑوسی کو تنہا چھوڑ دے تو یہ عید نہیں بلکہ ہماری کوتاہی ہے۔ عید الفطر اس بات کا اعلان ہے کہ ہم نے رمضان المبارک سے تقویٰ سیکھا ہے اور تقویٰ صرف نماز و روزہ کا نام نہیں بلکہ دل کی پاکیزگی، زبان کی سچائی اور معاملات کی دیانت کا نام ہے۔ اگر عید کے بعد بھی ہمارے رویوں میں نرمی، ہمارے لہجے میں شائستگی اور ہمارے کردار میں اخلاص نہ آئے تو ہمیں سوچنا ہوگا کہ ہم نے رمضان المبارک سے کیا حاصل کیا۔ عید خوشی کا دن ضرور ہے مگر یہ خوشی اطاعت کے دائرے میں رہ کر ہے، یہ خوشی اللہ تعالیٰ کی رضا کے ساتھ وابستہ ہے، یہ خوشی اس وقت مکمل ہوتی ہے جب ہمارے آس پاس کے لوگ بھی سکون اور محبت محسوس کریں۔ لہٰذا! ہمیں چاہیے کہ عید کو محض ایک تہوار نہ بنائیں بلکہ اسے دلوں کی اصلاح کا موقع سمجھیں۔ اپنے اندر جھانکیں، اپنے دل سے کینہ نکالیں، حسد کی آگ بجھائیں، نفرت کے کانٹے چن لیں اور محبت کے بیج بوئیں۔ اگر ہم نے ایسا کر لیا تو یقیناً ہماری عید حقیقی معنوں میں عید ہوگی۔ وہ عید جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا ذریعہ بنے، جو ہمارے اعمال میں قبولیت کا رنگ بھر دے اور جو ہمارے معاشرے کو اخوت و اتحاد کی خوشبو سے معطر کر دے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم عید الفطر کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ منائیں، اپنے دلوں کو پاک کریں، رشتوں کو مضبوط بنائیں اور نفرتوں کے بجائے محبتوں کو فروغ دیں۔ ہماری عیدیں محض رسم نہ ہوں بلکہ ایمان کی تازگی، باطن کی صفائی اور کردار کی بلندی کا اعلان ہوں۔ تبھی ہم کہہ سکیں گے کہ ہم نے واقعی عید الفطر منائی ہے۔ وہ عید جو شکر، اخوت اور قلبی طہارت کا پیغام لے کر آتی ہے۔

ام المؤمنین سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

از: شیخ الحدیث علامہ افتخار احمد قادری مدنی، مدینہ منورہ

گوشۂ خواتین

باسمہ تعالیٰ

ام المؤمنین بنت صدیق اکبر خلیفہ رسول ﷺ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نازش امہات المؤمنین، حبیبۂ محبوب رب العلمین، عورتوں میں سب سے بڑی عالمہ، فاضلہ اور فقیہ حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا۔

والد جلیل: خلیفۂ اول سیدنا ابو بکر عبد اللہ بن ابو قحافہ عثمان بن عامر قریشی تیمی ہیں۔ مردوں میں سب سے پہلے مشرف بہ ایمان ہونے والے اور امت مسلمہ میں علی الاطلاق سب سے افضل ہیں۔

مکہ مکرمہ کی مقدس سرزمین پر پیدا ہوئے اور اسی ارض مقدسہ پر پروان چڑھے عرب کی بہت عظیم اور مبارک شخصیت اور قریش کے ایک باوقار سردار تھے۔ سرکار کے ایسے معتمد صحابی جو سفر ہجرت کے ہم سفر اور یار غار تھے، رب تعالیٰ فرماتا ہے:

''ثانی اثنین اذھما فی الغار اذیقول لصحبہ لا تحزن ان اللہ معنا''

[توبہ آیت ۴۰]

ترجمہ: صرف دو جان سے جب یہ دونوں غار میں تھے جب سرکار اپنے یار سے فرماتے تھے غم نہ کرو بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

آیت مذکورہ میں سیدنا ابو بکر کو رب ذوالجلال نے صاحب نبی ﷺ فرمایا، جن کی عفت کو سرکار نے اس طرح بیان فرمایا۔

''لو کنت متخذا خلیلا غیر ربی لاتخذت ابا بکر ولکن اخوۃ الاسلام ومودتہ۔''

[صحیح بخاری حدیث نمبر ۳۶۵۴]

ترجمہ: اگر مجھے میرے رب کے علاوہ کا خلیل بنانا ہوتا تو میں ابو بکر کو اپنا خلیل بناتا لیکن وہ میرے اسلامی بھائی ہیں۔

آپ نبی ﷺ کے بعد مسند خلافت کے تاج عظمت سے مشرف ہوئے اور دو سال ساڑھے تین ماہ زینت خلافت رہے اور تریسٹھ سال کی عمر مبارک میں ۱۳ھ میں رب کے حضور حاضر ہوئے۔

والدہ ماجدہ: سیدہ ام رومان بنت عامر بن عویم ہیں۔ [اسد الغابۃ ج ۷ ص ۰۷۳]

ان کے پہلے شوہر عبد اللہ بن حارث کی وفات کے بعد سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے نکاح فرمایا۔ شروع شروع اسلام لانے کا شرف ان کو بھی حاصل ہے سرکار کے ہاتھوں پر بیعت کی اور آل ابی بکر کی معیت میں سفر ہجرت سے مشرف ہوئیں۔ ۸ھ کے بعد مدینہ منورہ میں رحلت فرمائی۔ اور آسودۂ جنت البقیع ہوئیں۔ ان کا سلسلہ نسب بھی شجرۂ نبوی میں ،، کعب بن مرہ ،، سے جاملتا ہے۔

سیدہ عائشہ صدیقہ کا حسن وکمال:

حضرت سیدہ عائشہ بڑی باوقار بے حد حسین و جمیل خاتون تھیں اسی لیے انکو ،، حمیراء ،، سراپا حسن وجمال کہا جاتا تھا۔ ایک موقع پر سرکار نے فرمایا: "خذوا نصف دینکم من ھذہ الحمراء" اس پیکر حسن جمال سے تم لوگ نصف دین حاصل کرلو۔

[زوجات النبی الطاہرات ص ۶۳]

سرکار ﷺ نے انکے علاوہ کسی باکرہ سے نکاح نہ فرمایا۔ اور ازواج میں سب سے زیادہ ان سے محبت فرمائی۔

علامہ ذہبی فرماتے ہیں: ان سے زیادہ علم والا امت محمدیہ میں بلکہ صنف نازک میں مطلقا ان سے بڑھ کر کوئی عالمہ نہیں یہ دنیا وآخرت میں نبی ﷺ کی زوجہ مکرمہ ہیں اس سے بڑھ کر کیا کوئی اعزاز واکرام ہو سکتا ہے۔

مرویات حضرت عائشہ صدیقہ:

احادیث کے ذخیرہ میں دو ہزار دو سو دس [۲۲۱۰] احادیث طیبہ ان سے مروی ہیں۔ [سیر اعلام النبلاء۔ ج ۳ ص ۴۳۷]

حضرت عائشہ کے امتیازات:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: مجھے ایسے نو [۹] امتیازات سے ممتاز کیا گیا ہے کہ حضرت مریم کے بعد یہ خصائص کسی کو نہ دیئے گئے۔ [۱] سیدنا جبرئیل اپنی ہتھیلی میں میری تصویر عالم بالا سے لیکر اترے اور رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا آپ ان سے نکاح فرمائیں۔

[۲] میرے سوا کسی دوشیزہ سے میرے نبی ﷺ نے نکاح نہ فرمایا۔

[۳] سرکار ﷺ عالم بالا اور رفیق اعلی میں ایسے پہونچے کہ ان کا سر اقدس میری گود میں تھا۔

[۴] سرکار ﷺ کی قبر مبارک میرے گھر میں آراستہ کی گئی۔

[۵] ملائکہ میرے گھر کے چاروں جانب جلوہ گر ہوتے تھے۔

[۶] وحی ایسے عالم میں بھی نازل ہوتی جب میں حضور کے ساتھ لحاف میں ہوتی۔

[۷] مجھے یہ شرف وکرامت حاصل ہے کہ سرکار ﷺ کے جگری دوست اور خلیفۂ اول کی بیٹی ہوں۔

[۸] میری عفت وعصمت کے بیان میں لوح محفوظ سے آیات کا نزول ہوا۔

[۹] میں کائنات کے سب سے زیادہ پاکیزہ اور طیب ﷺ کی پاکیزہ اور طیبہ ہوں مجھ سے مغفرت اور رزق کریم وطیب کا وعدہ کیا گیا۔ [سیر اعلام النبلاء ص۴۳۸]

عائشہ صدیقہ سے سرکار کی محبت:

ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی وفات کے بعد نبی صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ سے نکاح فرمایا، جنگ بدر کے بعد آپ رضی اللہ عنہا نے بیت نبوت کو زینت بخشی۔ سرکار ﷺ سب سے بڑھ کر ان سے محبت فرماتے تھے، فاتح مصر عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ عرض کیا یارسول اللہ سب سے زیادہ محبوب آپ کو کون ہے؟ فرمایا: عائشہ پھر دریافت کیا اور مردوں میں سب سے زیادہ محبوب کون؟ فرمایا اس کے والد ابو بکر۔ [بخاری فضائل الصحابہ]

پیدائش:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بعثت نبوی کے چار یا پانچ سال بعد مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئیں، والدین کریمین شروع شروع اسلام سے متمتع ہیں۔ والد ماجد سیدنا ابو بکر مردوں میں سب سے پہلے اسلام کی نعمت عظمیٰ سے بہرور ہوئے اور انکے باعث ان کی زوجۂ مکرمہ ام رومان اور ان کی دونوں صاحبزادیاں اسماء وعائشہ رضی اللہ عنہن بھی اسلام کے دامن سے وابستہ ہو گئیں۔

اس طرح حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا نے خالص اسلامی بلکہ نہایت پاکیزہ ودینی ماحول میں پرورش پائی آقا ﷺ کے ساتھ پورے گھر کے نہایت قریبی اور مستحکم تعلقات تھے، ام المؤمنین فرماتی ہیں کہ جب میں نے ہوش سنبھالا تو والدین کریمین کو اس حال میں پایا کہ یہ دونوں اسلامی تعلیمات پر پورے طور سے کاربند تھے، مزید فرماتی ہیں: لم یمر علینا یوم الا یأتینا فیہ رسول اللہ ﷺ طرفی النہار بکرۃ وعشیا۔ [البخاری ص۶۷۴]

ترجمہ: کوئی دن ایسا نہ گزرتا کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر صبح شام تشریف نہ لاتے ہوں۔

مکہ مکرمہ کی ایک بہت خوشحال فیملی میں نہایت ناز ونعم کے ساتھ حضرت عائشہ پلی بڑھیں۔ ان کے والد گرامی سرزمین مکہ کے ایک متمول اور بڑے تاجر تھے، اور وہاں کے بڑے بڑے تاجروں کا طبقہ ان کے ساتھ خوش گوار مراسم اور اچھے تعلقات رکھتا تھا۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی ایک امتیازی شان یہ بھی تھی کہ اپنی ثروت کا بیشتر حصہ اسلام کو پھیلانے میں صرف فرماتے تھے۔ سفر ہجرت کیلئے صدیق اکبر نے دو عمدہ اونٹنیاں تیار کی اور پانچ ہزار درہم یا اس سے بھی زیادہ سرکار کی خدمت میں پیش کر دیا۔ راہ خدا میں آزاد کرنے کیلئے غلاموں کی ایک بڑی تعداد کو آپ نے خریدا اور انہیں لوجہ اللہ آزاد کر دیا۔ ان میں نہایت مشہور صحابی مؤذن رسول اللہ حضرت بلال بھی ہیں اسی لیے سرکار نے ارشاد فرمایا: جس کسی نے ہم پر جو بھی خرچ کیا ہم نے اس کی مکافات اچھا بدلہ دیدیا سوائے ابو بکر کے۔

فان له عندنا يدا يكافه الله بها يوم القيامة۔ما نفعني مال أحد قط ما نفعني مال ابی بكر ولو كنت متخذا خليلا لا تخذت ابا بكر خليلا الا وان صاحبكم خليل الله۔

ہمارے اوپر ابو بکر کا ایسا احسان ہے کہ جسکا بہترین بدلہ رب تعالی ان کو قیامت میں عطا فرمائے گا، کسی کے مال نے مجھے اتنا فائدہ نہ پہونچایا جتنا کہ ابو بکر کے مال نے پہونچایا، اگر میں کسی کو خلیل بناتا تو یقینا ابو بکر کو خلیل بناتا اور سنو تمہارے آقا اللہ کے خلیل ہیں۔ [الترمذی۔حدیث ۳٦٦١]

حضور سے نکاح:

سرکار ﷺ سے آپ کا رشتۂ ازدواج آسمان سے نازل ہوا۔ حضرت ام المؤمنین خود بیان فرماتی ہیں: کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے تین راتوں سے تم کو دکھایا جارہا ہے، ایک فرشہ ریشم کے ایک ٹکڑے میں تمہاری تصویر لیکر آیا ہے اور عرض کیا کرتا ہے کہ یہ ہیں آپ کی بیوی۔ میں تمہارے چہرے کو کھولتا تو کیا دیکھتا کہ تم ہو۔ میں کہتا کہ اگر یہ اللہ عزوجل کی جانب سے ہے تو وہ اسے ضرور مکمل فرمائے گا۔ [بخاری، مناقب الانصار، باب تزوج عائشہ رضی اللہ عنہا]

ایک اور روایت میں اس طرح ہے کہ ام المؤمنین فرماتی ہیں: حضرت جبرئیل علیہ السلام ان کی تصویر ریشم کے ایک ٹکڑے میں نبی ﷺ کے پاس لیکر آئے اور عرض کیا: دنیا وآخرت میں یہ آپ کی زوجہ ہیں۔ [سیر اعلام النبلاء ص ۳۴۷ ج ۳]

نکاح مبارک کے وقت ام المؤمنین کی عمر کیا تھی؟

حضرت عائشہ خود بیان فرماتی ہیں: نبی ﷺ نے حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد مجھ سے نکاح فرمایا میں اس وقت چھ سال کی تھی، اور حضور کے پاس رخصت ہو کر آئی تو میری عمر نو سال کی تھی میں جھولے پر کھیل رہی تھی کچھ عورتیں میرے پاس آئیں اور مجھے بنایا سنوارا اور میرے بال بہت اچھے تھے۔ حضور کے پاس لے کر آگئیں۔ [سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۴۴۲]

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چونکہ بہت کمسن تھیں اس لیے جھولے پر بھی کھیلا کرتیں اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ بھی یہ تفریحی سلسلہ رہتا ایک بڑی خوبصورت روایت ملاحظہ کیجئے۔

ام المؤمنین خود بیان فرماتی ہیں کہ: ”میں بچیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی اور اس دوران رسول اللہ ﷺ تشریف لاتے تو میری سہیلیاں شرم کے باعث حضور سے چھپ جاتیں، پھر حضور جب باہر جاتے تو یہ سہیلیاں باہر نکلتیں اور ہم کھیل میں لگ جاتے، کبھی حضور کو احساس ہوتا کہ بچیاں چھپ گئی ہیں تو سرکار خود ان کو میرے پاس بھیجتے اور ہم کھیل میں مصروف ہو جاتے۔“ [سیر اعلام النبلاء لذھبی۔ص ۴۴۳۔ج ۳]

تیر بازی وغیرہ دیکھنے کا شوق وشغف بھی ام المؤمنین میں خوب تھا۔ خود بیان فرماتی ہیں کہ: اہل حبشہ مسجد کے صحن میں ایام عید میں نیزوں سے کھیلتے، میں حجرے سے پردہ کے ساتھ ان کا یہ کھیل دیکھتی اور میرے حضور اپنی چادر مبارک سے پردہ کرتے، میں خوب دیکھتی اس حد تک کہ میں خود جب اوب جاتی تب حضور ہٹتے، پھر فرماتی ہیں، آپ اندازہ کرسکتے ہیں مجھ جیسی کم سن بچی ایسے کھیلوں کی کیسی دلدادہ تھی۔ [ایضا۔ ص ۴۴۴۔ ج ۳]

اور حضور کا کرم بالائے کرم یہ تھا کہ ام المومنین کی دل جوئی خوب خوب فرماتے۔ جب ام المومنین کا دل بھر جاتا تب ہٹتیں اور حضور ان کا اخیر تک ساتھ دیتے تھے۔

سرکار نے فرمایا: خيركم خيركم لأهله وأنا خيركم لأهلي۔

ترجمہ: تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے اہل میں اچھا ہو اور میں بھی اپنے اہل میں اچھا ہوں۔

نبی اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے ان کو اپنی زوجیت سے کیوں نوازا؟

اس کے دو اہم مقاصد تھے: ایک آپ کی غیر معمولی ذہانت وذکاوت اور عصمت وپاکبازی اور دوسرا آپ کے والد ماجد کا اسلام اور پیغمبر اسلام کے لیے ایثار۔ حضور ﷺ نے جن مقاصد کے تحت متعدد خواتین کو شرف زوجیت عطا فرمایا تھا، حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا کے ساتھ نکاح کرنے سے وہ تمام مقاصد حاصل ہوئے تھے۔ اس نکاح کے ذریعے حضور ﷺ نے اپنے سب سے معتمد اور مخلص صحابی کو اس کی جانثاریوں کا سب سے بڑا صلہ جو اس دنیا میں ممکن تھا عطا فرمایا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا حضور ﷺ کی زوجہ محترمہ ہونے کی وجہ سے متعدد احکام کے نزول کا سبب بنی تھیں جو امت کے لیے رحمت تھے۔ مثلا تیمم کی عظیم نعمت ملنے کا سبب ہی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا ہیں۔ ام المؤمنین حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا نے دینی تعلیمات کے اشاعت کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ آپ ہی کا حصہ ہیں۔ [ضیاء النبی۔ ص ۴۹۵۔ ج ۷]

فضائل ومناقب:

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے فضائل ومناقب اتنے ہیں کہ اس پر ایک مستقل جلد ہو جائے۔ بعض فضائل ملاحظہ کیجیے۔ [۱] امام بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے: وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے: ''فضل عائشة على النساء كفضل الثريد على سائر الطعام'' [فضل عائشۃ۔ ص ۵۳۲۔ ج ۱]

ترجمہ: عائشہ کی فضیلت عورتوں پر ایسی ہے جیسے ثرید کی فضیلت دیگر کھانوں پر۔

[۲] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن فرمایا: ''يا عائشة هٰذا جبرئيل يقرئك السلام فقلت وعليه السلام ورحمة الله وبركاته'' [بخاری فضل عائشہ۔ ص ۵۳۲]

ترجمہ: اے عائشہ یہ جبرئیل حاضر ہیں تم کو سلام کہتے ہیں، میں نے کہا ان کو بھی میرا سلام اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکات۔

پھر ام المؤمنین بہت عظیم بات فرماتی ہیں، میرے حضور وہ کچھ دیکھتے ہیں جو میں نہیں دیکھتی۔ حدیث بخاری میں دو زبردست باتیں بیان کی گئیں [۱] سیدنا جبرئیل علیہ السلام کا سلام ام المؤمنین حضرت عائشہ کو پہونچ رہا ہے [۲] سرکار وہ کچھ دیکھتے ہیں جو دوسرے نہیں دیکھتے

امام بخاری ایک حدیث روایت کرتے ہیں: حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ تعالی عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ''كمل من الرجال كثير ولم يكمل من النساء الامريم بنت عمران وآسية امرأة فرعون وفضل عائشة على النساء كفضل الثريد على سائر الطعام'' [فضل عائشہ۔ بخاری ج ا۔ ص ۵۳۲]

مردوں میں بہت سے لوگ کمال کو پہونچے مگر عورتوں میں تو مریم بنت عمران، اور آسیہ زوجہ فرعون اور عائشہ کی فضیلت عورتوں پر ایسی ہے جیسے ثرید کی فضیلت دیگر کھانوں پر۔

[۴] امام ذہبی ایک روایت تخریج فرماتے ہیں: حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ انکے والدین حضور کے پاس آئے اور عرض کیا: ہماری خواہش ہے کہ یارسول اللہ عائشہ کے لیے ایک دعا فرمائیں اور ہم سنیں، نبی ﷺ نے دعا فرمائی:

''اللهم اغفر لعائشة بنت ابى بكر الصديق مغفرة واجبة وباطنة''

.ترجمہ: اے اللہ عائشہ کو ضروری، ظاہری و باطنی مغفرت فرما. حضرت عائشہ کے والدین کریمین کو اس پر تعجب ہوا تو سرکار نے فرمایا: تم دونوں کو اس پر تعجب ہوا تو سنو! میری یہ دعا ہر اس شخص کیلئے ہے جس نے شہادت دی کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور میں اس کا رسول ہوں۔ [سیر اعلام النبلاء۔ ص ۴۴۰۔ ج ۳]

علمی مقام و مرتبہ:

علم میں حضرت عائشہ صدیقہ کا مقام نہ صرف امہات المؤمنین میں بلند ترین تھا بلکہ اکثر صحابہ بھی آپ کے علم سے استفادہ کرتے تھے حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ما اشكل علينا اصحاب رسول الله ﷺ قط فسألنا عائشة الا وجئنا عندها منه علما. [ضیاء النبی ۴۹۶ ج ۷]

ہم اصحاب رسول اللہ ﷺ کو جب بھی کسی حدیث پاک میں سمجھنے میں مشکل پیش آئی اور ہم نے اس کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا تو ان کے پاس اس حدیث کے متعلق علم موجود تھا.

صرف علم حدیث میں ہی یہ ممتاز نہ تھیں بلکہ تفقہ میں بے مثل تھیں حضرت عروہ بن زبیر جو ان کی بڑی بہن حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے صاحبزادے اور عظیم عالم ہیں وہ فرماتے ہیں: ''ما رأيت امرأة اعلم بطب ولا فقه ولا شعر من عائشة'' [ضياء النبى]

ترجمہ: میں نے کسی عورت کو طب، فقہ اور شعر کے علوم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر نہ پایا.

تیمم کی اجازت حضور کی امت کی خصوصیات میں سے ہے، امت کو یہ نعمت حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی وساطت سے عطا ہوئی. ایک سفر میں آپ کا ہار گم ہو گیا، حضور ﷺ نے چند صحابہ کرام کو ہار کی تلاش کے لیے روانہ فرمایا. راستے میں نماز کا وقت ہو گیا. پانی موجود نہ ہونے کی وجہ سے ان صحابہ کرام نے بلا وضو نماز پڑھی، حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے تو یہ رنج والم کے ساتھ سارا واقعہ آپ کی خدمت میں پیش کیا. اسی وقت آیت تیمم نازل ہوئی جو قیامت تک امت مصطفے علیہ التحیۃ والثناء کے لیے بڑا انعام ہے، اسی لیے اس موقع پر انصار کے عظیم فرد حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:"جزاک اللہ خیرا ما نزل بک أمرالا جعل اللہ لک منه فرجاومخرجا وجعل للمسلمین برکة "[بخاری]

ترجمہ: اللہ تعالی آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، جب بھی آپ کو کوئی مشکل آئی، اللہ تعالی نے خود آپ کے لیے اس مصیبت سے نکلنے کا راستہ پیدا فرمایا اور وہ مشکل عام مسلمانوں کیلئے باعث برکت بن گئی۔

ام المؤمنین حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا میں اس قسم کی بے شمار خوبیاں اور صفات تھیں جن کی وجہ سے نبی ﷺ آپ سے تمام ازواج مطہرات کی نسبت زیادہ محبت فرماتے تھے۔ ام امؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کو سب سے بڑا اعزاز یہ حاصل ہوا کہ سرکار ﷺ نے اپنی حیات طیبہ کے آخری ایام حجرۂ عائشہ میں ہی گزارے اور یہی حجرۂ مقدسہ روضۂ رسول اور مسکن سید کائنات بنا۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا سرکار ﷺ کے آخری لمحات حیات کی تصویر کشی فرماتی ہیں:

میرے بھائی عبد الرحمن بن ابو بکر نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کیفیت یہ تھی کہ میں حضور کو اپنے سینے سے سہارا دیے ہوئے تھی، اور عبد الرحمن کے ہاتھ میں تازہ مسواک تھی۔ نبی ﷺ نے مسواک پر ایسی نظر ڈالی جیسے آپ اسے چاہ رہے ہوں میں نے وہ مسواک لی اور اپنے دانتوں سے اس کا برش تیار کیا اور صاف کیا اور حضور کو دیا، سرکار نے اس مسواک سے اتنے عمدہ انداز میں مسواک کی کہ ایسی مسواک کرتے میں نے کبھی نہ دیکھا تھا. سرکار ﷺ جیسے ہی مسواک سے فارغ ہوئے دست اقدس کو اٹھایا اور فرمایا: الرفیق الاعلیٰ اور یہ کلمات مبارکہ سرکار نے تین دفعہ بارگاہ رب میں عرض کیں اور اپنے رب سے جا ملے، حضرت ام المؤمنین بڑے فخر واعزاز کے انداز میں فرماتی تھیں کہ آقا ﷺ اس عالم میں اپنے رب سے ملے کہ حضور کا سر اقدس میرے سینے پر تھا۔ [بخاری ص ۶۳۹ ج ۲]

اسی بخاری کی ایک اور حدیث میں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا بیان فرماتی ہیں کہ:

آقا ﷺ کی آخری کیفیات کچھ اس طرح تھیں کہ وصال سے پہلے حضور کی پشت مبارک کو میں اپنے سینے سے سہارا دیئے ہوئی تھی میں نے اچھی طرح سنا سرکار دعا فرمارہے تھے:

اللھم اغفر لی وارحمنی وألحقنی بالرفیق۔ [بخاری ص ۶۳۹ ج ۲]

اے اللہ میری مغفرت فرما، مجھ پر کرم فرما اور مجھے رفیق اعلی سے ملادے۔ [ایضا]

اسی بخاری کی حدیث کا ایک ٹکڑا اور بھی ملاحظہ فرمایئے:

حضرت صدیقہ فرماتی ہیں کہ: میرے اوپر رب تعالی کے احسانات کا شمار نہیں مگر یہ احسان کتنا بڑا ہے کہ میرے سرکار ﷺ کا وصال مبارک میرے گھر میں ہوا، اور میرے دن [میری باری] میں ہوا اور میرے سینے پر ہوا۔ [ایضا ص ۶۴۰ ج ۲]

سبحانہ ما اعظم شانہ میرے خیال میں کائنات کے کسی فرد کو یہ اعزاز حاصل نہ ہوا کہ سید کائنات ﷺ خالق کائنات کے حضور حاضر ہو رہے ہوں اور سر اقدس اس کی ہنسلیوں پر ہو۔

آپ ذرا تامل تو فرمائیں کہ خلائق کے سب سے افضل و اکمل و اجمل ﷺ اپنے رب ذوالجلال کی جانب سفر کر رہے ہوں اور سر مبارک افضل نساء عالمیان کے سینے پر ہو، ان کا سینہ وہنسلیاں اور جسد اطہر کتنے عظیم و فضیل ہوئے۔ کیا کوئی مخلوق اس شرف و عظمت کو پہونچ سکتی ہے؟ سچ کہیے تو یہ اکرام خداوندی اور لطف ربانی صرف اور صرف ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا ہی کا حصہ تھا جس سے وہ بہرور ہوئیں۔

وصال: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا تقریبا ۵۳ سال تک عالم کو اپنے انوار و تجلیات سے مبہور و معمور کرنے کے بعد ۱۷ رمضان ۵۷ھ کو یوم بدر کبری کی شب اپنے خالق حقیقی سے جاملیں۔ ۶۳ سال چندماہ ان کی عمر مبارک ہوئی۔

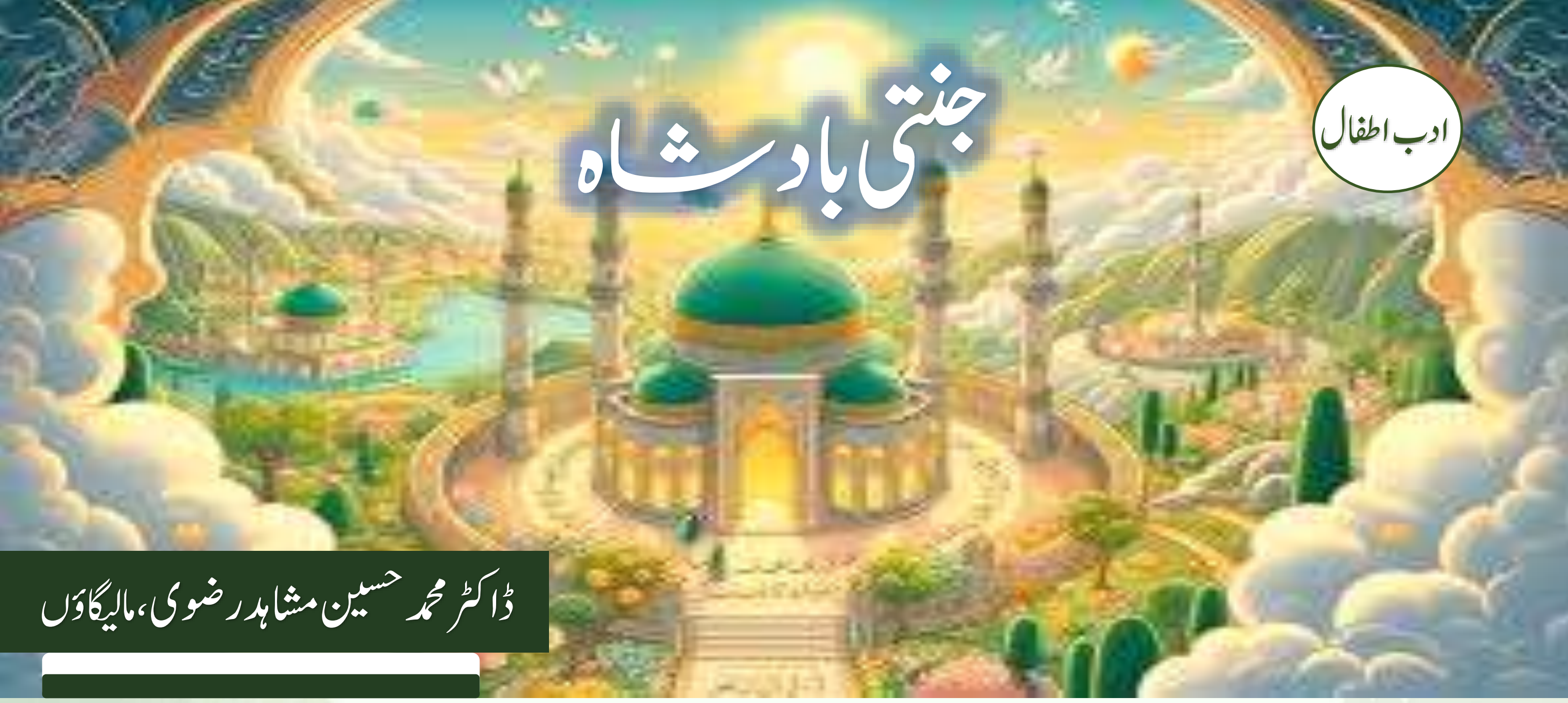
حضور کی عمر مبارک ۶۳ سال ہوئی اور اتنی ہی عمر شریف حضرت عائشہ صدیقہ نے پائی اور بفضلہ تعالی اس میں بھی ان کو سیرت نبی ﷺ کا حصہ ملا. سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دیگر امہات المؤمنین کے ساتھ دفن ہونے کی سعادت پائی۔ [ایضا ص ۶۴۸ ج ۳ و نزہۃ القاری ص ۷۶ ج ۱]

رب کائنات ان کی اور دیگر امہات المومنین اور تمام مونین و مومنات کی قبروں پر رحمت و نور اور کرم کی بارش دائماً فرماتا رہے۔ آمین۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے شعر پر مسک الختام کے طور پر اپنا مقال مکمل کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

حصان رزان ما تزن بریبۃ
وتصبح غرثیٰ من لحوم الغوافل

[بخاری ص ۵۹۷ ج ۲]

ترجمہ: (حضرت عائشہ) پاکباز صاحب وقار ہیں ہر شک سے بالا واعلی اور غیبت و چغلخوری سے بہت دور رہنے والی حبیبہ حبیب رب العلمین ہیں۔



ادب اطفال

جنتی بادشاہ

ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی، مالیگاؤں

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک خدا رسیدہ بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ بادشاہ تو جنت کے باغوں میں سیر کر رہا ہے۔ اور ایک ایسا شخص جسے بہت نیک خیال کیا جاتا تھا، دوزخ کی آگ میں جل رہا ہے۔ بزرگ نے حیران ہو کر پوچھا، کیسا عجیب ماجرا ہے، لوگ تو یہ خیال کرتے تھے کہ بادشاہ دوزخ کا ایندھن بنے گا اور پرہیز گار جنت میں جائے گا لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹ ہے۔ بادشاہ جنت میں اور پرہیز گار دوزخ میں ہے۔

صدا آئی، اس کا باعث یہ ہے کہ بادشاہ ہمیشہ درویشوں کی عزت کرتا تھا اور انہیں اپنے پاس بٹھا کر خوش ہوتا تھا لیکن یہ نیک آدمی ہمیشہ اسی فکر میں رہتا تھا کہ کسی طرح بادشاہ کے دربار میں رسائی ہو جائے اور اس کا مقرب بن جائے پس یہی سبب پہلے کے انعام پانے اور دوسرے کا عذاب میں مبتلا ہونے کا ہے۔

خدا محبوب رکھتا ہے نہ گدڑی کو نہ کملی کو
اسے محبوب رکھتا ہے جو اچھے کام کرتا ہے
ضروری یہ نہیں سر پر فقیروں جیسی ٹوپی ہو
نہیں معیوب یہ گر تو لباس اچھا پہنتا ہے

وضاحت: اس حکایت میں حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے اس حدیث شریف کی تشریح کی ہے کہ خدا تمہارے چہروں کو نہیں بلکہ تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے۔ اگر کوئی صاحب ثروت بڑھیا لباس پہن کر اچھے کام کرتا ہے تو وہ اس درویش سے اچھا جو لباس تو فقیرانہ پہنتا ہے لیکن اس کا دل دنیاوی لذتوں میں پھنسا ہوا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ

آہ حضرت علامہ الشاہ رکن الدین اصدق چشتی صاحب رحمہ اللہ

دس رمضان المبارک ۱۴۴۷ھ بروز شنبہ یہ جانکاہ خبر موصول ہوئی کہ جماعت اہل سنت کے عظیم عالم اور ہمارے سلسلے کے بزرگ صفت شیخ طریقت، نمونۂ اسلاف، خطیب الاسلام حضرت علامہ الشاہ رکن الدین اصدق چشتی صاحب اس دار فانی سے کوچ کر کے اپنے مالک حقیقی کے جوار رحمت میں پہنچ گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ

اس خبر سے بے حد صدمہ ہوا، آپ کا انتقال نہ صرف سلسلہ اصدقیہ کا خسارہ ہے بلکہ جماعت اہل سنت اور دنیائے تصوف کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔

کچھ ایسے بھی اٹھ جائیں گے اس بزم جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

خطیب الاسلام حضرت علامہ الشاہ رکن الدین اصدق چشتی صاحب کا شمار برصغیر کے ممتاز شیخ طریقت، جلیل القدر فاضل، بے نظیر خطیب، صاحب طرز ادیب اور جماعت اہل سنت کے متبحر و باوقار عالم باعمل میں ہوتا تھا۔ آپ قطب الارشاد سیدنا خواجہ قیام اصدق رضی اللہ عنہ کے گلشن کے ایک گل سرسبد اور خانوادۂ اصدقیہ کے چشم و چراغ تھے۔ حضرت والا کی ولادت ۱۹۴۳ء میں آستانہ چشتی چمن پیر بیگہ شریف ضلع نالندہ، بہار میں ہوئی۔ درس نظامی کی تعلیم کے لیے آپ ۱۹۵۶ء میں مدرسہ انوار العلوم (گیا) تشریف لے گئے، یہاں چار سال حضرت مولانا منظور غوثی رحمہ اللہ کے زیر تربیت رہ کر متوسطات تک تعلیم حاصل کی۔ اس زمانہ میں جلالۃ العلم حافظ ملت حضرت علامہ عبد العزیز محدث مبارک پوری نور اللہ مرقدہ کی درسگاہ کا پورے ہندوستان میں غلغلہ برپا تھا چنانچہ ۱۹۶۱ء میں آپ گیا سے مبارک پور ضلع اعظم گڑھ تشریف لے گئے اور حضور حافظ ملت کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر شرف تلمذ سے شرف یاب ہوئے اور اس طرح ۱۱ شعبان المعظم ۱۳۸۶ھ میں آپ دورۂ حدیث کی تکمیل کر کے سند فراغت و دستار فضیلت سے نوازے گئے۔

فراغت کے بعد مدرسہ شرفیہ رفیع گنج اورنگ آباد پھر ادارۂ شرعیہ پٹنہ کی مسند تدریس کو زینت بخشا، 1980 میں مدرسہ اصدقیہ مخدوم شرف (بہار شریف) کی بنیاد رکھی جہاں آج دو منزلہ عمارت میں حفظ و قرات اور متوسطات تک درس نظامی کی تعلیم

جاری ہے۔ اس کے علاوہ مدرسہ اصدقیہ شہودیہ (پیربیگہ شریف) مدرسہ اصدقیہ مخدوم شعیب شیخ پورہ وغیرہ متعدد مدارس آپ کے زیر انتظام بحسن و خوبی دینی و علمی خدمات میں مصروف ہیں۔ آپ بیک وقت تحریر و تقریر دونوں میں یکساں قدرت رکھتے تھے۔ تحائف اصدقی، بے نقاب چہرے، تاریخ ہجرت، حیات اصدق، آئینہ مخدوم جہاں، خطرات کے بادل، سعودی عرب جانے والوں کے نام ایک پیغام، تجلیات بشیری، بارہ روشن کرامتیں، آئینہ حافظ ملت، درس رسول، سیرت خواجۂ دوعالم، مترجم مکتوبات اصدقی وغیرہ آپ کی وہ مبارک تصانیف ہیں جس نے اصحاب علم و فن اور ارباب فکر و دانش سے خراج تحسین وصول کر لیا ہے۔ ایک زمانے میں آپ پندرہ روزہ اخبار "رفاقت پٹنہ" کے ایڈیٹر تھے، پھر 1995ء میں آپ نے اپنی ادارت میں کلکتہ سے ماہنامہ جام شہود جاری کیا اور بہار شریف میں مستقل قیام کے بعد اسی ماہنامہ کو سہ ماہی میں تبدیل کر کے تاحیات اس کے چیف ایڈیٹر اور سرپرست کی حیثیت سے خدمت لوح و قلم کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ دینی، ملی، ملکی اور سیاسی عناوین پر سینکڑوں مضامین آپ کے اشہب قلم سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو کر ہدایت خلق کا ذریعہ بنے۔

آپ کو اپنے والد ماجد محبوب الاولیاء حضرت الشاہ بشیر الدین اصدق غوثی صاحب رحمہ اللہ (مرید و خلیفہ عارف باللہ، قطب سہسرام حضرت خواجہ سید شاہ غلام غوث شہودی اصدقی چشتی قادری قدس سرہ العزیز، سہسرام) سے سلسلہ غوثیہ اصدقیہ میں بیعت و خلافت حاصل تھی، والد ماجد رحمہ اللہ کی رحلت کے بعد آپ ان کی مسند کے وارث و جانشین ہوئے اور 35 سال سے زیادہ مسند رشد و ہدایت پر متمکن رہ کر دین و سلسلہ کی خدمت میں ہمہ تن مصروف رہے۔ ملک کے طول و عرض میں آپ کے مریدین پھیلے ہوئے ہیں، سلسلہ اصدقیہ کو آپ کی ذات سے خوب فروغ ہوا۔۔ دین و سنیت، ملک و ملت اور مشرب و مسلک کے لیے آپ کی ہمہ جہت خدمات آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ بالخصوص "حیات اصدق" اور "مکتوبات اصدقی" آپ کی وہ عظیم قلمی فتوحات میں سے ہیں جن پر تمام اصدقی خانقاہوں کو فخر ہے بلکہ برسوں سے اصدقی مشائخ پر یہ ایک قرض تھا جو آپ کی ذات والاصفات سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ افسوس کہ یہ عبقری شخصیت اب ہمارے درمیان نہیں رہی۔

اس غمناک موقع پر میں اپنی طرف سے اور خانوادۂ غوثیہ و سلسلہ غوثیہ کے تمام افراد و وابستگان کی جانب سے مولانا شاہ سیف الدین اصدق چشتی صاحب اور مولانا شاہ نور الدین اصدق مصباحی صاحب اور خانوادہ کے جملہ افراد کی خدمت میں تعزیت پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالی حضرت علیہ الرحمہ کی قبر پر رحمت و انوار کی بارش فرمائے اور تمام وابستگان کو صبر جمیل بخشے۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالی علیہ وسلم

از: سید عارفین اصدق غوثی غفرلہ
سجادہ نشیں خانقاہ غوثیہ شہودیہ اصدقیہ، سہسرام، بہار، انڈیا

نعت سید عالم ﷺ

از: مولانا سید فاضل اشرفی میسوری

کوچۂ سیدِ ابرار میں آ جاتے ہیں
ہم بڑی حسرتِ دیدار میں آ جاتے ہیں

سر پہ جب گردشِ ایام کی دھوپ آتی ہے
ہم تری یاد کے چھتنار میں آ جاتے ہیں

جاں نواز ان کے تبسم کی ادا ہے ایسی
گُن مسیحائی کے، بیمار میں آ جاتے ہیں

غور کرتے ہوئے اُس حسنِ ازل کے بارے
ہم عجب عالمِ اَسرار میں آ جاتے ہیں

لیتی ہے رحمتِ حق بڑھ کے بلائیں ان کی
وہ جو مجرم ترے دربار میں آ جاتے ہیں

جب بھی ہوتا ہے فزوں جذبۂ شُکرِ نعمت
قریۂ مدحتِ سرکار میں آ جاتے ہیں

ایک ہم ہی نہیں جبریل سے شہپر والے
حلقۂ گیسوئے خمدار میں آ جاتے ہیں

مجھ پہ فاضل ہیں جو سرکار کے الطاف و کرم
اس کے آثار بھی اشعار میں آ جاتے ہیں

منقبت

سید الشہداء حضرت سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ عنہ

از: مولانا سلمان رضا فریدی، مسقط، عمان

تسخیر فنا حمزہ، تعمیر بقا حمزہ
قرطاس شجاعت پر، تحریر وفا حمزہ

یوں بدر کی وادی میں کفار کو للکارا
باطل کو ڈراتی ہے اب بھی وہ ندا حمزہ

سرکار نے بخشا تھا پرچم جو قیادت کا
لہراتا ہے عالم میں اب بھی وہ لوا حمزہ

بیباک تری ہستی، غیور تری فطرت
جاں باز ہے دل تیرا اے شیر خدا حمزہ

سرداری تمھیں حاصل، ہے سارے شہیدوں کی
یوں حق کی حفاظت میں کی جان فدا حمزہ

اللہ نے فرمایا سرکار سے لا تحزن
غم تیری شہادت کا کچھ ایسا ہوا حمزہ

احسان نہ بھولے گا میدان احد تیرا
ہے اُس کی شبِ جاں میں اب تیری ضیا حمزہ

ہر دشمنِ ملت پر، غالب ہو فریدی بھی
پہنایئے اب اسکو نصرت کی عَبا حمزہ



بچوں میں دینی شعور بیدار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں اسلامی معلومات فراہم کی جائیں، دینی واقعات، مذہبی ثقافت اور اسلامی تاریخ سے روشناس کرایا جائے۔ اگر بچے کم عمری ہی سے اسلامی تاریخ، ثقافت اور ادب کے موضوعات پر توجہ دیں گے تو ان کا مستقبل یقیناً پُر نور اور تابناک ہو گا۔

اس کالم میں چند سوالات اور ان کے جوابات شامل ہیں۔ طلبہ و طالبات سے گزارش ہے کہ ہر سوال کو اس کے درست جواب کے ساتھ ملا کر درج ذیل وہاٹس ایپ نمبر پر ارسال کریں۔ آپ کے درست جوابات آئندہ شمارے میں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیے جائیں گے۔ (ادارہ)　　　مدیر کا وہاٹس ایپ نمبر +27838463037

سوالات	جوابات
سوال: لوح محفوظ کا کلام کس چیز کا ہے؟	ام القریٰ
سوال: شیخ الانبیاء کس نبی کا لقب ہے؟	ابراہیم
سوال: ذوالہجرتین کس نبی کا لقب ہے؟	نوح
سوال: قوم عرب میں کتنے نبی پیدا ہوئے؟	نو
سوال: کتنے انبیا اولوالعزم ہیں؟	چار
سوال: وضو کہاں فرض ہوا	نور
سوال: اذان کی مشروعیت کہاں ہوئی؟	مدینہ منورہ
سوال: کیا اذان حکم اس امت کے ساتھ خاص ہے؟	نہیں
سوال: کیا قلم نے سب سے پہلے نماز کا حکم لکھا؟	جی
سوال: حج کس سن میں فرض ہوا؟	پانچ



تشکر و تحسین

ماہنامہ الغوث (فروری) کے سوال وجواب کارنر میں صحیح جوابات ارسال کرنے والے معزز قارئین کے اسما

شہباز حسین ابن امتیاز حسین

محلہ میواتی ٹولہ، سہسرام، ضلع روہتاس، بہار

شمیلہ اختری اصدقی

دھنباد، جھارکھنڈ

فجر فاطمہ

محلہ شیر گنج، سہسرام، روہتاس، بہار

میزاب رحمت

رام گڑھ، جھارکھنڈ

سوال وجواب کے کارنر میں شرکت کرنے اور جوابات ارسال کرنے پر ہم آپ تمام کے ذوق علم اور شوق مطالعہ کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالی آپ تمام کو حسنات وبرکات سے مالامال فرمائے اور خیر کثیر سے نوازے۔ آمین

(ادارہ)